



مآلک مرام

کچھ



کے بارے میں

مکتبہ جامعہ ملیہ
دہلی

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.**

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ





کچھ
ابوالکلام آزاد
کے ہاگے میں



مالک-سام

ملک جامعہ ملیہ
دہلی

© مالک سہ ماہی ۱۹۸۹

137129



صدما دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شکاحیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

قیمت: =/51

پہلی بار جون ۱۹۸۹ء

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاوس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

پیش گفتار

۱

جُون ۱۹۲۷ء میں ”الہلال“ کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اس کا پہلا دور جولائی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک تھا۔ دوسرا، جب یہ ”البلاغ“ کے نام سے ۱۹۱۵-۱۹۱۶ء میں شائع ہوتا رہا۔ اور اب تیسرا جون ۱۹۲۷ء سے شروع ہوا۔ افسوس کہ یہ بھی چھ مہینے سے تجاوز نہ کر سکا۔ ۹ دسمبر کا پرچہ اس کا آخری شمارہ ثابت ہوا :

نوشِ درخشیدہ، ولے دولتِ مستعجل بود

اس دور میں خود مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے بہت کم مضامین شامل اشاعت ہوئے۔ بیشتر کام مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی مرحوم کا تھا۔ مورثا آزاداب کانگریس کے ممتاز اور معروف ترین لیڈروں میں سے تھے۔ کانگریس اور تحریکِ خلافت کے سلسلے میں وہ زمین کا گز بنے ہوئے تھے۔ صبح کہیں، شام کہیں، آج یہاں، کل وہاں۔ غما ہے، ایسے میں ایک ہفتہ وار پرچے کے لیے کچھ لکھنے کی فرصت کہاں میسر آ سکتی تھی!

میں ۱۹۲۶ء میں لاہور آیا تھا۔ یہاں میں نے بی اے میں داخلے لیا۔ الہلال جاری ہوا، تو میں نے ان پچھ مہینوں کے بعد شمارے تو لیے ہی، اس کے علاوہ تب ایاب پرچے میں اشتہار شائع ہوا کہ پہلے دور کے پرچے بھی دستیاب ہو سکتے ہیں، تو میں نے مطلوبہ رقم جمع کر وہ بھی منگوائے۔

اور یوں اس کا پورا فائل میری نظر سے گذر گیا۔

اس سے پہلے مجھے ادھر ادھر مولانا آزاد کی صرف چند متفرق تحریریں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس ششماہی میں ”الہلال“ کے تازہ اور پرانے پرچے دیکھنے پر انھیں بلاستین عاب پڑھنے کا موقع ملا۔ آج جب اس بات پر ۶۲-۶۳ برس گذر چکے ہیں، میرے لیے یہ محال ہے کہ میں اپنے جذبات اور خیالات ٹھیک ٹھیک بیان کر سکوں، جو اس وقت میرے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ گزشتہ چار پانچ برس سے ”نگار“ باقاعدہ میری نظر سے گزرتا رہا تھا۔ اس لیے میں زبان کی ثقالت اور فارسی عربی کی بھاری بھکم ترکیبوں سے بہت حد تک مانوس ہو چکا تھا۔ میں نے اسلامیات اور بالخصوص قرآن کا مطالعہ بھی اپنے ہائی اسکول کے دور ہی میں شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ میں عربی سے نا بلد تھا، لیکن اپنی ابتدائی فارسی تعلیم کے بل بوتے پر میں ”الہلال“ کے دور اول کے مضامین سے بہت محظوظ، بلکہ مستفید اور مستفیض ہوا۔ ان کا مسائل پر نئے انداز اور استدلال سے خطیبانہ اسلوب میں لکھنا سحر سے کم نہیں تھا۔

میں اس سے قبل نیاز فتنچوری سے متاثر تھا۔ مولانا آزاد کی ان تحریروں نے وہ اثر گویا دو آتشہ کر دیا۔ اور میں اپنی تحریروں میں قصداً ان کا تتبع کرنے لگا۔ چنانچہ میرے ابتدائی مضامین میں یہ اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ الحمد للہ میں جلد ہی اس سے آزاد ہو گیا۔ خیر، یہ دوسرا موضوع ہے۔

یہاں ایک جملہ معترضہ غالباً بھجلا نہیں ہوگا۔

”الہلال“ (خصوصاً دور اول) دیکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ نیاز فتنچوری نے مولانا آزاد کے تتبع اور تقلید کی شعوری کوشش کی ہے۔ ”الہلال“ کے اس ابتدائی دور میں نیاز کا کلام بھی نظر سے گزرا جس سے اس بات کی مزید شہادت ہتیا ہوئی کہ نیاز ”الہلال“ کے باقاعدہ قاری اور اس کے مداح تھے۔

میں لاہور، لاہور کا طالب علم تھا کہ ۱۹۳۱ء کے اواخر (بلکہ ۱۹۳۲ء کے اوائل) میں ترجمان القرآن

کی پہلی جلد لاہور پہنچی۔ میں نے بھی اسے دیکھا۔ یہاں عالم ہی دوسرا تھا۔ کہاں ”اہلہاں“ کی خطابت اور لغت سازی، اور کہاں ”ترجمان القرآن“ کی دلنشین سبک روی اور سلاست! بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے قرآن کے کم و بیش دس اردو ترجمے ضرور دیکھے ہونگے۔ لیکن جو لطف ”ترجمان القرآن“ کے سادہ ترجمے میں آیا، وہ الّا ماشاء اللہ اور کہیں نہیں ملا۔ یہاں کوئی اچھ پیچ نہیں۔ زبان وہی، جو سب بولتے، اور کسی لغت کی مدد کے بغیر آسانی سے سمجھتے ہیں۔ فقروں کا وہی درو بست جو اردو کے معنی کا اور صرف و نحو کا اقتضا ہے۔ کہیں رکنے یا سر کھلانے کی ضرورت نہیں۔

سورہ فاتحہ کی تفسیر ایسی جربستہ اور مدلل مفصل اور علوم جدید پر حاوی ہے کہ بایں شاید۔ سورہ فاتحہ ام کتاب کہلاتی ہے، اور اس میں پورے قرآن اور اسلام کی تعلیم کی روح آگئی ہے۔ لیکن اگر کسی نے مولانا آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ نہیں دیکھی، تو اسے معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ ”روح“ ہے کیا! اس تفسیر سے جہاں قرآنی تعلیم کی ہمہ گیری، اس کی بلاغت زبان اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس سے خود مولانا آزاد کے سحر اور شرف نگاہی، مسائل کے ادراک و فہم اور اپنے علم کے نتائج کے ابلاغ کی قدرت پر بھی برہان قاطع مہیا ہوتی ہے۔ جزاء اللہ و حسن الجزاء۔ اسی زمانے میں ”ترجمان القرآن“ ہی سے متعلق مجھے دو مین خط بھی مولانا آزاد کی خدمت میں لکھنے کا اتفاق ہوا۔

۳

۱۹۳۹ء کے شروع میں حکومت ہند نے دنیا کے بعض ممالک میں تجارتی ذمہ قائم کیے تھے۔ ان میں ایک دفتر مصر میں اسکندریہ کے مقام پر تھا۔ اس کے لیے میرا انتخاب ہوا۔ اور حکومت نے نہ جانے سے پہلے ہمیں تین ہفتے کلکتہ کے دفتر میں ٹریننگ حاصل کرنا ہوگی۔ میں ۱۳ مارچ ۱۹۳۵ء کی صبح کلکتہ پہنچا۔ دلی سے روانگی سے قبل یہاں سے ایک دوست نے سنٹرل ہوٹل (پیرنجن ایونیو) کے منیجر کو خط لکھ دیا تھا۔ پتا پتہ میں ریلوے اسٹیشن سے سیدھا ہوٹل گیا، اور وہاں ایک کمرہ کرایے پر لے کر سامان کھول دیا۔ اگلے دن یکم اپریل کو ڈیڑھ بجے اسکو ایئر اپنے دفتر

حاضر ہو گیا۔

اتفاق سے اس سے اگلے ہی دن اتوار تھا۔ میں نے صبح کے ناشتے کے بعد بالی گنج میں مولانا آزاد کے مکان کی راہ لی :

بلاکشان محبت بکوے یار روند
میں کوئی دس بجے وہاں پہنچا ہونگا۔ عین سڑک کے کنارے بڑی کشادہ کوٹھی تھی۔ چاروں طرف وسیع صحن کے درمیان رہائشی مکان تھا۔ بڑے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اٹے ہاتھ ایک کمرہ تھا، اس میں محمد اجل خان صاحب کے ملاقات ہوئی جو سال بھر پہلے (۱۹۳۸ء) مولانا کے سکرٹری ہوئے تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت مولانا کے سلام کو حاضر ہوا ہوں۔ نام پوچھا، کام پوچھا، مقام پوچھا۔ میں نے بتایا کہ میری ان سے پہلے کی ملاقات نہیں ہے، اور محض زیارت مقصود ہے۔ نہ معلوم، انھیں صبح سے شام تک ایسے کتنے زائرین سے واسطہ پڑتا ہوگا۔ فرمایا: آپ اپنا نام اور پتہ لکھ دیجیے، میں مولانا سے دریافت کرنے کے بعد آپ کو مطلع کر دوں گا۔ میں نے تعمیل حکم میں ضروری کوائف لکھ دیے، اور اتنا زبانی کہا کہ میں ایک دفتر میں کام کرتا ہوں، جہاں چھٹی صرف اتوار کے دن ہوتی ہے۔ اس لیے ممنون ہونگا اگر ملاقات کسی اتوار کی مقرر کی جائے۔ دو کے یہ کہ کلکتے میں میرا قیام صرف تین مہینے کا ہے۔

میں اٹھنے لگا، تو نہ معلوم، کس بات سے ان کا دل سپنچا۔ فرمایا: دو منٹ رک جائیے۔ میں ابھی جا کر ان سے دریافت کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئے۔ دو تین منٹ بعد واپس آئے اور فرمایا کہ آپ اندر جاسکتے ہیں، وہ ابھی آپ سے مل لینگے۔ اور اشارہ کر کے بتایا کہ سامنے زمین ہے، اس پر سے اوپر جائیے، برآمدے میں سیدھے ہاتھ سامنے کا پہلا کمرہ ہے۔ میں صحن طے کر کے زمین تک پہنچا۔ کوٹھی کی کرسی اونچی تھی۔ تین چار سیڑھیاں اوپر جا کر برآمدے میں داخل ہوا۔ محمد اجل خان صاحب کے بتائے ہوئے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں ٹھٹکا ہی تھا کہ اندر سے آواز آئی: "تشریف لائے" میں داخل ہو گیا۔

متوسط سائز کا (۱۵ × ۱۵ فٹ) مربع کمرہ ہوگا۔ بائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا پلنگ بچھا تھا۔ اس کے برابر میں تپائی پر کچھ کتابیں رکھی تھیں۔ دو خالی کرسیاں تھیں۔ کمرے کے کونے میں چھوٹی

تیپائی پر جگ میں پانی اور ایک گلاس۔ مولانا خود اس پلنگ کاؤتیکے سے ٹیک لگائے، پانچویں بجائے نیم دراز لیٹے یا بیٹھے تھے۔ وہ اس سے چند دن پہلے (۱۴ مارچ) الہ آباد کے ریلوے اسٹیشن پر کیلے کے چھلکے پر پانچویں بجانے سے پھسلے اور گر گئے تھے، جس سے ان کی الٹی ایڑی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ گھٹنے کی چپنی بھی اپنی جگہ سے ہل گئی ہے۔ اسی باعث وہ پورا وقت بستر پر گزارنے پر مجبور تھے۔ ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا، اور اس پر سفید چادر پڑی تھی۔

میں نے اس سے قبل صرف ایک مرتبہ انھیں لاہور میں دیکھا تھا۔ غالباً، ۱۹۲۷ء کے اوائل کی بات ہے، سامن کمیشن کی تشکیل اور اس کی ہندستان میں آمد کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ بیشتر سیاسی حلقے اس پر سخت ناراض، بلکہ برا فرختہ تھے کہ کمیشن میں کوئی ہندستانی نہیں لیا گیا تھا۔ اس لیے اکثر جماعتوں نے کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ لاہور کے سر محمد شفیع اور ان کے ہم نوا بائیکاٹ کے حق میں نہیں تھے۔ لاہور میں جلسہ ہوا، جس کا مقصد حکومت کی پالیسی کے خلاف احتجاج اور لوگوں کو کمیشن کے بائیکاٹ کی ترغیب دلانا تھا۔ جلسہ غالباً موری دروازے (یا شاید بھائی دروازے) کے باہر کیٹی باغ میں ہوا تھا۔ اسٹیج پر منجملہ اور اصحاب کے مولانا آزاد اور علامہ اقبال اور مولانا محمد علی تشریف فرما تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ ہم نے اسلام کی تعلیم ان دونوں بزرگوں — اقبال اور آزاد — سے پائی۔ آج ایک ہمس کمیشن سے تعاون کی تلقین کر رہے ہیں اور دوسرے اس کے بائیکاٹ کی۔ ہم عجیب گونگوں میں ہیں کہ کس کا متبع کریں۔ (اس میں اشارہ اقبال کی فارسی مثنویات (اس روز روز) اور مولانا آزاد کے ہفتہ وار الہلال کی طرف تھا)

میں نے اپنا تعارف کرایا۔ انھیں ہماری ”ترجمان القرآن“ کے سلسلے کی خط و کتابت یاد آگئی۔ میں کوئی گھنٹہ بھر ٹھہرا۔ میری تعلیم اور علمی ادبی تربیت اور غیبات اور سرگرمیوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میں نے اس دوران میں جو پین و مضامین لکھے تھے، ان سے متعلق سن کر خوشی کا اظہار کیا۔ دو صدیوں کے انسانی کے الفاظ کہے۔ غرض، گھنٹہ ڈیڑھ دو بجے گفتگو میں کس یا، اور حلوہ بھی نہ ہو کہ ہم اتنی دیر سے باتیں کر رہے ہیں۔

جب میں نے اجازت چاہی، تو دریافت فرمایا کہ کلکتے میں کب تک قیام رہیں گے، میں نے بتایا کہ تین

۱۰
 مہینے، جون کے اواخر تک؛ اس کے بعد مصر جانے کی تیاری ہے۔ حکم دیا کہ جتنے دن کلکتہ میں ہو، اتوار، تعطیل کے دن تو لازماً بلا ناغہ آؤ، اور اگر ہفتے کے دوران میں بھی کوئی پھٹی اڑے تو آسکتا ہوں۔ میں شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

میں نے ان مین مہینوں میں کوئی اتوار ناغہ نہیں کیا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ مجھے اتوار کا انتظار رہنے لگا۔ ان ہفتہ واری ملاقاتوں میں مذہب، ادب، سیاست — غرض دنیا بھر کے گونا گوں موضوعات پر ان سے خوب باتیں ہوئیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس سے مجھے کتنا فائدہ ہوا۔ میں نے اپنی لہجہ بھر بہت پڑھا تھا۔ اردو اور فارسی میں بہت کچھ میری نظر سے گزر چکا تھا۔ اور عربی میں بھی کچھ شد بد حاصل تھی۔ لیکن ان کے مطالعے کی وسعت اور بولمونی اور استحضار اور ”گل افشانی گفتار“ کا صحیح اندازہ اس وقت تک محال تھا، جب تک کوئی شخص ان کے پاس نہ بیٹھے اور کسی موضوع پر ان سے گفتگو نہ کرے۔

مجھے افسوس ہے تو اس بات کا کہ میں نے کبھی ڈائری نہیں رکھی، نہ کبھی مجھے یادداشتیں رکھنے کی عادت رہی ہے۔ ورنہ یہ ملاقاتیں اتنی یادگار اور قیمتی تھیں، اور اس زمانے میں اتنے مختلف مضامین اور موضوعات پر ان سے مفصل گفتگو رہی کہ اگر وہ قلمبند ہو گئی ہوتیں، تو جانے، کیا کچھ محفوظ ہو گیا ہوتا۔ لیکن اب افسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے!

میں یکم جولائی کو رخصتی ملاقات کے لیے حاضر خدمت ہوا۔ فرمایا کہ آپ مصر جا رہے ہیں وہاں عربی سیکھیے اور اس کی تکمیل کیجیے۔ اس زبان میں بے انتہا قیمتی سرمایہ علم و ادب ہے۔ پھر ایک کاغذ کے پرزے پر مین کتابوں کے نام لکھے، اور یہ کہتے ہوئے اسے میرے ہاتھ میں دے دیا کہ سب سے پہلے یہ مین کتابیں مطالعہ کرنا چاہئیں۔ یہ کتابیں تھیں: (۱) ادب الکاتب (ابن قتیبہ)؛ (۲) فقہ اللغة (ثعالبی)؛ (۳) کلید و دمنہ۔

۴

میں خاندان کے دو کے افراد کے ساتھ ۲۲ جولائی ۱۹۳۹ء کو بمبئی سے پی اینڈ او کمپنی کے بحری جہاز ”راولپنڈی“ سے روانہ ہوا۔ ہم ۳۱ جولائی صبح کے وقت پورٹ سعید اترے اور اسی

شام ریل سے اسکندریہ وارد ہوئے۔ اگلی صبح یکم اگست میں اپنے دفتر میں حاضر ہو گیا۔ ایک ہینیا بعد، یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔

میں جب یہاں سے چلا ہوں، تو مجھے سے کہا گیا تھا کہ تمہیں تین برس تک مصر میں قیام کرنا پڑے گا۔ لیکن جنگ شروع ہو جانے کے بعد لیبیا اور مصر کا علاقہ جنگ کا اکھاڑا بن گیا۔ اٹلی اور جرمنی نے اپنی فوجیں لیبیا میں اتار دیں۔ ان کا ارادہ مصر پر چڑھائی کا اور اس رستے سے ہندستان پہنچنے کا تھا۔ اس فوج کی کمان آزمودہ کار جرمن جرنیل رومیل ROMMEL کے ہاتھ میں تھی۔

ادھر انگریزی (اتحادی) فوجیں قاہرہ میں اہرام کے سایے میں ڈیرے ڈالے پڑی تھیں۔ کئی مرتبہ اطالوی اور جرمن فوجیں یلغار کرتی ٹمصر کی سرحد طبروق تک پہنچ گئیں اور پھر انگریزوں نے انھیں واپس ڈھکیل دیا۔

انگریزی فوج میں ہندوستانیوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ اسکندریہ رستے میں تھا۔ اس پر بندرگاہ ہونے کے سبب، قاہرہ کے مقابلے میں، وہاں کی آب و ہوا بہت معتدل اور توشگوار تھی۔ اسی لیے فوجیوں کی تفریح اور تھپی گزرنے کے لیے شہر کے مضامات میں خاص کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ جہاں مسلسل ہندوستانی فوجی اور افسر آتے جاتے رہتے۔ روزانہ کسی نہ کسی افسر سے ملاقات ہوتی اور اس سے جنگ کی تازہ ترین خبریں ملتی رہتیں۔ غرض عجیب کشمکش اور جوش و خروش کے دن تھے۔ یہ تیشویشناک صورت حال کئی برس تک قائم رہی۔

ظاہر ہے ان خطرناک حالات میں یہاں ہندوستان سے کوئی دوسرا شخص میری جگہ مصر جانے کے لیے کیوں تیار ہونے لگا تھا۔ یوں میں سات برس تک وہاں سے زائل سکا۔ اور ۱۹۳۹ء کا گیا کہیں دسمبر ۱۹۴۱ء میں مین ہینے کی رخصت پر وطن لوٹا۔ ہفتہ بھر پنجاب میں (چھالیہ) اپنے گالورہ کر میں، ۱۹۴۱ء کے اوائل میں دلی پہنچا۔

مولانا آزاد اب ہندوستان کی مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم تھے۔ یہاں پہنچتے ہی میں نے اعلیٰ صبح ان کے دفتر ٹیلیفون کیا۔ ان کے سکرتار نے حسب معمول نام پوچھا۔ میں نے بتایا تو دریافت کیا کہ کیا کام ہے؟ میں نے کہا: کام دو کچھ نہیں، صرف سلام کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ آپ میرا نام لیجیے، وہ اگر حاضری کی اجازت دے دیں، مجھے اس سے مطلع کر دیجیے۔ کوئی ادھے

۱۲
گھنٹے میں انہوں نے اطلاع دی کہ کل صبح ساڑھے دس بجے دفتر میں آجائے پھر بتایا کہ نارنگی بلاک
میں کمرہ نمبر ۱۵ (۹) ہے۔ بڑے گیٹ سے داخل ہونے کے بعد سیدھے ہاتھ برآمدے کا
آخری کمرہ۔

میں اگلے دن حسب الحکم وقت مقررہ پر حاضر ہو گیا۔ دروازے پر کھڑے چیرا سی کو میں نے بتایا کہ مجھے
ساڑھے دس بجے بلایا ہے، اور اپنا کارڈ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے واپس آکر دروازہ کھولا،
اور مجھ سے اندر جانے کو کہا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا ہوں، تو پروفیسر سہالویں کبیران کے بائیں ہاتھ
کھڑے کچھ کہ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مولانا نے ان سے کہا: اچھا، اس پر غور کرنے کے لیے بعد کو
آجائے۔ اس پر پروفیسر صاحب موصوف کمرے سے باہر چلے گئے، اور خود انہوں نے کرسی پر سے اٹھنے
کی کوشش کی۔ میں لپک کر ان کے قریب پہنچ گیا اور عرض کیا کہ تشریف رکھیے۔ مگر اگر مصافحہ کیا اور
کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ میرے بیٹھتے ہی، ان کا پہلا سوال اس گفتگو کے تسلسل میں تھا، جہاں
ساڑھے سات برس قبل ہم نے کلکتے میں (میری آخری الوداعی ملاقات کے دن) چھوڑی تھی۔ گویا یہ
طویل وقفہ ایک لمحے میں غائب ہو گیا۔ زمان و مکان کا یہ تصور صرف مولانا آزاد ہی کے لیے ممکن تھا۔
میں ان کی منصبی مصروفیتوں اور ذمہ داریوں سے ناواقف نہیں تھا۔ خود انہوں نے بھی فرمایا۔ مکان
پر آئیے؛ ذرا اطمینان سے مہر کی باتیں ہونگی۔ ۲۰-۲۵ منٹ کے بعد میں نے اجازت چاہی۔ دوین
دن بعد ان کے مسکن (۴، کنگ ایڈورڈ روڈ) پر حاضر ہوا۔ دیر تک مہر، وہاں کی زبان، تعلیم، طریقہ
تعلیم وغیرہ سے متعلق گفتگو رہی۔ دلی کے اس قیام کے دوران میں مجھے ان سے زیادہ ملاقات کا موقع
نہیں ملا، صرف دوین مرتبہ سلام کے لیے حاضر ہوا۔ میں لمبی غیر حاضری کے بعد وطن آیا تھا۔ رشتہ داروں
اور دوست احباب کا شدید اصرار تھا کہ میں ان سے جلد ملاقات کروں۔ اس کے لیے مجھے لکھنؤ، بھوپال،
جالندھر، بنارس وغیرہ کا سفر کرنا پڑا۔

بہر حال میں رخصت ختم ہونے پر مارچ ۱۹۶۱ء میں مصر واپس چلا گیا۔

۵

اب کا گنا میں کہیں ۱۹۵۲ء کے شروع میں پھر دوہینے کی رخصت پر ہندستان آیا۔ میرے یہ پانچ برس

مصر اور عراق میں بسر ہوئے تھے۔ اس اثنا کا سب سے اہم واقعہ ملک کی آزادی اور تقسیم اور پاکستان کا وجود میں آنا تھا۔ میرے حکومت ہند کے بیشتر احباب کراچی پہنچ چکے تھے۔ جی میں آئی کہ ان سے ملاقات کی جائے۔ چنانچہ میں نے قصداً ایسے بھری جہاز سے سفر کیا، جو تین دن کے لیے کراچی رکتا تھا۔ عدن سے میں نے کراچی اور لاہور کے احباب کو تار سے اطلاع دے دی کہ میں فلاں دن کراچی پہنچوں گا۔ چنانچہ لاہور سے مولانا غلام رسول مہر کراچی آگئے تھے۔

یہ تین دن خوب دھما چوکڑی رہی۔ پیر حسام الدین راشدی نے ایک شام ۳۰۔۴۰ دوستوں کو کھانے پر جمع کر لیا۔ کھانے کے بعد قوالی کی محفل بھی گرم ہوئی۔ میں حضرت پیر پکاڑو کو وہیں ملا (غالباً ان کی راشدی مرحوم سے کچھ خاندانی رشتے داری بھی ہے) ماہر القادری سے پہلی ملاقات بھی اسی دن ہوئی۔ ماہر صاحب اپنے ساتھ ”فاران“ کے دو تین برسوں کے شماروں کا پلندہ لیتے آئے تھے، یہ انھوں نے تحفہً دیا۔ ایک شمارہ (غالباً مئی ۱۹۵۱ء کا) الگ سے دیتے ہوئے کہا: اس میں ایک مضمون خاص طور پر آپ کے دیکھنے کا ہے۔

میں نے قوالی کے دوران ہی میں وہیں بیٹھے بیٹھے دس پندرہ منٹ میں اس شمارے کی درق گردانی کر لی۔ اس مضمون کا عنوان تھا: ”پردہ اٹھتا ہے“ اور یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف تھا۔ اس میں ان کے وطن اور تعلیم اور خاندان اور سفروں وغیرہ کے بارے میں سخت معاندانہ تنقید تھی۔ اس کے عنوان ہی سے اس کے لب و لہجہ کی زہرناکی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگلی صبح میں نے اس کا مولانا غلام رسول نہر کے ذکر کیا۔ وہ بھی یہ مضمون دیکھ چکے تھے۔ صرف اتنا کہا: ہاں، بھائی! یہ دن بھی دیکھنا تھے۔ خدا کی شان! آج ماہر صاحب کو بھی مولانا آزاد پر تنقید، بلکہ تنقیص کی جرأت ہوئی۔ نفور تو، اے چرخ گرداں! نفو۔

ماہر القادری مرحوم، خدا معلوم کیوں، مولانا آزاد کے شدید مخالف تھے۔ اس پر مزید یہ مبرا کہ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ یاں سے کچھ ایسے اہل اثر اصحاب پاکستان پہنچے، جو مولانا آزاد کے ذاتی مخالف تھے۔ ان میں اتنی جرأت تو نہیں تھی کہ کھل کر ملا اپنی مخالفت ہا اظہار کریں، لیکن نجی مجلسوں میں اور اپنے ہم خیال احباب کے خط و کتابت میں وہ زہر اگلتے رہتے تھے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد یہ حجاب بہت حد تک اٹھ گیا، اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ ماہر صاحب کی

ان میں سے ایک بزرگوار سے ملاقات ہوئی۔ دونوں ہنخیال (بلکہ ہم مقصد) تو تھے ہی، بس پھر کیا تھا: خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے "فرزانے" دو۔ اب ماہر صاحب نے "قاران" میں کبھی کناہی سے، کبھی صراحت سے مولانا آزاد کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ ان کا یہ ۱۹۵۱ء کا مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

میں یہاں دلی پہنچا، تو حسب معمول مولانا کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ گفتگو کے دوران میں مجھے اس مضمون کا خیال آیا۔ میں نے کہا، مجھے کچھ معلومات درکار ہیں، میں ایک مضمون کا جواب لکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے تفصیل بتائی، تو اس پر انھوں نے جو کچھ کہا، وہ میرا زندگی کے لیے رہنما اصول بن گیا۔ فرمایا:

کیا آپ کے پاس کرنے کو کوئی اور کام نہیں کہ آپ کو لوگوں کے اعتراضات کا جواب لکھنے کی سوجھی ہے۔ یہ بالکل فضول اور بیکار کام ہے۔ اگر معترض نے کوئی صحیح بات لکھی ہے، تو اپنی اصلاح کر لیجیے۔ اور اگر غلط لکھا ہے تو اس سے درگزر کیجیے۔ اس سے آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا اور تلخی میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اس سے جو وقت بچے گا اس میں کوئی اور مفید کام کیجیے۔

بہر حال انھوں نے جواب لکھنے سے سختی سے منع کر دیا۔ اور میں نے ان سے اتفاق کر لیا۔ میں اس سفر میں اپنی بیوی اور بڑے بیٹے کے ساتھ آیا تھا۔ باقی خاندان وہیں مصر میں والدہ کے پاس تھا۔ تھوڑے دن بعد تار ملا کہ بچوں میں سے ایک سخت بیمار ہو گیا ہے۔ اس لیے میں خصمت کی مقررہ میعاد منقطع کر کے واپس چلا گیا۔

۶

اپنی مرکزی حکومت کی ۲۵، ۲۶ سالہ ملازمت کے دوران میں مجھے یہاں دلی میں صرف تین چار برس رہنے کا اتفاق ہوا، ورنہ ساری مدت بیرون ملک کی ہرزہ گردی میں بسر ہوئی۔ یہاں قیام کا سب سے لمبا زمانہ ۱۹۵۵-۱۹۵۸ء کا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کلکتے کے بعد مجھے ان کی خدمت میں بارہا حاضر ہونے اور مختلف موضوعات پر طویل گفتگو اور استفادے کا موقع ملا۔ علامہ محمد

میں نومبر ۱۹۵۴ء میں بمبئی پہنچا تھا۔ مہینا بھر وہاں خاندان کے ساتھ گزارا اور دسمبر کے اواخر میں واپس آیا حسب معمول یہاں پہنچنے کے بعد میں پہلی فرصت میں کوٹھی (م، کنگ ایڈورڈ روڈ) پر حاضر ہوا۔ اس مرتبہ ایک دلچسپ لطیفہ ہوا۔

قدرتاً پہلے محمد اجمل خان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بہت تپاک سے ملے۔ فرمایا: آج کل بہت مصروف ہیں۔ دیکھیے، میں ان سے دریافت کر کے آپ کو مطلع کرونگا۔ میں خاموش واپس چلا آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ محمد اجمل خان مرحوم کچھ عجیب اکل کھڑے مزاج کے بزرگ تھے۔ اگر ان کا بس جلتا تو کوئی شخص مولانا سے نہ مل سکتا۔ بہر حال ہفتہ عشرہ گزر گیا۔ چند دن بعد میں کسی تقریب میں ایک جگہ گیا۔ مولانا آزاد بھی اس میں موجود تھے۔ وہ ایک طرف جا رہے تھے کہ انہوں نے مجھے دیکھا۔ ٹھٹک کر رگ گئے۔ میں فوراً بڑھ کر خدمت میں حاضر ہوا اور جھک کر آداب بجالایا۔ پوچھا: آپ کب آئے ہیں؟ عرض کیا: دس بارہ دن ہوئے۔ اس پر تعجب کے لہجے میں دہرایا: دس بارہ دن! میں سمجھ گیا۔ فوراً جواب دیا کہ میں آتے کے ساتھ ہی مکان پر سلام کو حاضر ہوا تھا لیکن محمد اجمل خان صاحب نے بتایا کہ آپ ان دنوں بی مصروف ہیں، آپ سے دریافت کر کے وہ مجھے مطلع کریں گے۔ یہ سن کر فرمایا: دیکھیے، خان صاحب اس مجمع میں کہیں ضرور ہونگے۔ زرا انھیں تلاش کر کے بلائیے۔ ہم دونوں حاضر ہوئے، تو ان سے فرمایا: آئندہ جب کبھی مالک رام صاحب مجھ سے ملنا چاہیں، مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ ڈائری دیکھ کر جس دن وقت خالی ہو، انھیں بلا لیجیے۔

اب کے ایک اور غیر معمولی بات ہوئی۔ ۱۹۵۴ء کے آخری سال کبھی کبھی وہ خود مجھے بلا بیٹھتے تھے۔ محمد اجمل خان صاحب سے کہہ دیتے کہ کل صبح مالک رام کو بلا لیجیے۔ وہ مجھے وزارتِ خارجہ میں ٹیلیفون پر اطلاع دے دیتے کہ کل صبح آجائیے۔

ستم یہ تھا کہ ملنے کا وقت وہی علی الصباح پانچ بجے کا۔ ان دنوں میرا قیام قرول باغ اور پوسار روڈ کی درمیانی بستی (ویسٹ ایکٹیشن ایریا) میں تھا۔ گرمی کے موسم میں تو آسان تھا لیکن پانچ بجے صبح ساڑھے چار بجے وہاں سے بائیسکل پر کنگ ایڈورڈ روڈ پہنچنا کارے دار دو الہ معاملہ تھا۔ لیکن الحمد للہ، میں امتحان میں پورا اترا، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں حاضر نہ ہوا ہوں یا دیر سے پہنچا ہوں۔

۱۶
 اب کے میں اپریل ۱۹۵۸ء تک دلی میں رہا۔ ان سے میری آخری ملاقات جمعہ،، فروری کو ہوئی
 پندرہ دن بعد ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو وہ وہاں جا پہنچے، جہاں ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی باری پر
 جانے والا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط
 اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

رحمہ اللہ تعالیٰ

عرفت زتی بفسنہ الحزائم۔ مجھے اپنے عزم و ارادہ کے ناپائیدار اور ناکام رہنے سے
 اپنے رب کے قادر مطلق ہونے کا یقین ہوا۔ اس مجموعہ مضامین کی اشاعت سے پھر ایک مرتب
 یہ حقیقت سامنے آئی۔ میرے اجاب کو معلوم ہے کہ گزشتہ تین چار برس سے میری تندرستی ٹھیک
 نہیں ہے، جس سے پڑھنے لکھنے کا کام بہت کم ہو گیا ہے۔ اسی باعث میں نے اپنے آخری مجموعے "تحقیق
 مضامین" کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ اپنی علالت کے پیش نظر میرا خیال نہیں کہ اب اس کے بعد
 میں کوئی اور مجموعہ مرتب اور شائع کر سکوں گا۔ اس کے باوجود یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔
 فالحمد للہ۔

میں نے گزشتہ تیس برسوں میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے بارے میں مختلف موضوعات
 پر چند مضامین قلمبند کیے تھے۔ یہ سب ملک کے رسائل و جرائد میں منتشر پڑے تھے۔ ان میں سب سے
 قدیم ان کی وفات کے فوراً بعد شائع ہوا تھا۔

مولانا آزاد کی ولادت ۱۸۸۸ء میں ہوئی تھی۔ پارساں حکومت ہند اور ملک نے ان
 صد سالہ جنم دن منانے کا فیصلہ کیا۔ مجھ سے فرمائش کی گئی کہ موقع کی مناسبت کے بدلے
 مضامین جمع کر دوں۔ اجاب نے ان کے جمع کرنے میں مستعدی سے تعاون کیا، اور کسی غیر معمولی
 دقت کے بغیر یہ جمع ہو گئے۔ میں ان سب کا ہر دل سے ممنون ہوں۔ اصلی دقت ان پر نظر ثانی
 کی تھی، جس کے بغیر میں انھیں شائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال جوں توں یہ کام بھی ہو گیا، اور
 آپ کے سامنے ہے۔

ایک بات کی معذرت چاہتا ہوں :

مولانا مرحوم کی مختلف سرگرمیاں کچھ اس طرح سے ایک دو کے سے مربوط ہیں کہ آپ اجتناب

کچھ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں
 ۱۷ لاکھ کوشش کریں، ایک کے بیان میں دوسری کا ذکر ناگزیر ہے۔ اس لیے آپ ان مضامین میں کہیں کہیں
 تکرار سے دوچار ہونگے۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ تمہید کے طور پر ان کے خاندان
 کا تعارف کرانے کے لیے بسا اوقات ایک ہی بات بار بار لکھی گئی ہے۔ ممکن ہے، پڑھنے والے اس سے
 بیلطف ہوں۔ میری مجبوری یہ تھی کہ موجودہ حالات میں میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ان
 مقامات کو حذف کر کے انھیں پھر ایک رشتے میں منسلک کر لیتا۔
 بہر حال اگر قاری اس سے صرف نظر کر سکیں، تو شکر گزار ہوں گا۔

اس مجموعے میں دو مضمون ”غبارِ خاطر“ اور ”تذکرہ“ کے عنوان سے ہیں۔ یہ دونوں میری مرتب کردہ
 ان کتابوں کے مقدمے ہیں جو ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ میں اکادمی کے
 اصحاب مجاز کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ان مضامین کو اس مجموعے میں شامل کرنے کی اجازت عنایت
 فرمائی۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ الْعَظِيمِ۔

صَالِكِ رَام

نئی دہلی

یکم جون، ۱۹۸۹ء

فہرست مضامین

- ۱ - مولانا آزاد کی تاریخ ولادت ۲۱
- ۲ - مولانا ابوالکلام آزاد (پہلے بیس برس) ۲۵
- ۳ - مولانا آزاد بحیثیت صحافی ۵۱
- ۴ - مولانا آزاد کی خطابت ۶۹
- ۵ - مولانا آزاد کے احسانات اُردو پر ۷۴
- ۶ - تحریک آزادی کی مذہبی بنیاد (افکار آزاد کی روشنی میں) ۸۷
- ۷ - غالب اور ابوالکلام آزاد ۱۳۷
- ۸ - نجارِ خاطر ۱۴۴
- ۹ - تذکرہ ۱۶۱
- ۱۰ - کچھ کرنے کے کام ۱۷۳
- ۱۱ - ابوالنصر غلام یسین آہ ۱۸۰

مولانا آزاد کی تاریخ ولادت

بظاہر مولانا آزاد کی تاریخ ولادت سے متعلق کوئی اختلاف یا الجھن نہیں ہونی چاہیے تھی کیونکہ یہ انھوں نے خود لکھی تھی لیکن خدا بھلا کرے ہمایوں کبیر کا کہ انھوں نے اس کا موقع پیدا کر دیا۔

ہوا یہ کہ مولانا آزاد کی زندگی کے آخری دو برسوں میں ہمایوں کبیر نے ان سے اپنی سوانح عمری لکھنے کی درخواست کی۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں، مرحوم اپنے بارے میں کچھ کہنے یا لکھنے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ ہمایوں کبیر کی درخواست پر بھی انھوں نے انکار کر دیا۔ لیکن انھوں نے مولانا آزاد کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ ملک کی آزادی (۱۹۴۷ء) سے پہلے کے دس بارہ برس کے واقعات قلمبند کر دیں کیونکہ یہ ملک کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس زمانے میں انھوں نے انگریز حکومت سے گفت و شنید میں کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے سرگرم حصہ لیا تھا۔ لہذا یہ ضروری تھا کہ مستقبل کے مورخ کو معلوم ہو کہ ان ایام میں کیا ہوا اور تحریک آزادی کمن ماحول سے گزر کر اپنی منزل مقصود تک پہنچی۔ اس پر مولانا نے رتنا مندی کا اظہار کیا اور ہمایوں کبیر نے ان سے معلومات حاصل کرنے کے بعد کتاب "انڈیا وٹس فریڈم" مرتب کی۔

بدقسمتی سے کتاب کے شائع ہونے سے پہلے ہی فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا کا انتقال ہو گیا۔ کتاب کہیں جنوری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس پر ہمایوں کبیر نے جو پیش لفظ لکھا، اس میں کہا:

مولانا کی خواہش تھی کہ یہ کتاب نومبر ۱۹۵۸ء میں، ان کے ۴۰ ویں یوم ولادت کے موقع پر شائع ہو۔ تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ اب کتاب شائع ہوگی تو وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہونگے۔

اس عبارت نے مولانا آزاد کی ولادت کو ایک متنازع فیہ مسئلہ بنا دیا۔ ایک تو تحریر انگریزی میں اور اس پر لکھی ہوئی ہمایوں کبیر کی۔ ہمارے سرکاری حلقوں نے تحقیق کیے بغیر اس پر اعتماد کر لیا۔ خدا معلوم بعد کو کس نے اور کس شہ پر، مہینہ نومبر پر تاریخ گیارہ کا اضافہ کر کے اسے ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء بنا دیا اور یوں ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء مولانا آزاد کی تاریخ ولادت تسلیم کر لی گئی۔ یہ تاریخ غلط ہے۔

مولانا آزاد نے خود سب سے پہلے اپنے مختصر حالات "تذکرہ" میں لکھے تھے۔ اس میں اپنی پیدائش سے متعلق لکھتے ہیں:

یہ غریب الدیار عہد و نا آشناے عصر و بیگانہ خویش و نمک پروردہ
ریش، معمورہ تمنا و خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے،
۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی
نما میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے تہتم.... والد مرحوم نے تاریخی
نام "فیروز بخت" رکھا تھا اور مصرع ذیل سے ہجری سال کا استخراج
کیا تھا:

جواں بخت و جواں طالع، جواں باد.

137129

۱۔ انڈیا انس فریڈرم (انگریزی) ۵۷ (پیش لفظ)

۲۔ تذکرہ (ساتھیہ اکیڈمی ایڈیشن: ۲۱۰)

اس سے معلوم ہوا کہ ولادت

۱- ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔

۲- ہجری تاریخ ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ تھی۔

۳- تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا گیا تھا اور بطریقہ جمل پیدائش کی تاریخ تھی 'جواں بخت و جواں طالع' جواں باد۔

۱۸۸۸ء کا اعادہ انھوں نے ہمایوں کبیر کی اسی انگریزی کتاب کے پہلے باب میں بھی کیا ہے جس میں مختصراً اپنے ابتدائی حالات درج کیے ہیں لیکن زیادہ تفصیل ہجری تاریخ میں ملتی ہے، جہاں ساتھ مہینہ بھی دیا ہے (ذوالحجہ)۔ وہ ہجری میں تاریخ ولادت لکھنے پر مجبور تھے کیونکہ دراصل یہی انھیں بتانی گئی ہوگی۔ وہ مکہ میں پیدا ہوئے، جہاں کی پوری معاشرت اسلامی تھی۔ ان کی ناخیاں اور داوصیاں کے دونوں گھرانے بھی ٹھیٹ اسلامی بلکہ علماء کے تھے۔ پس تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں جگہ ہجری کے سواے کوئی اور تقویم استعمال ہوتی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ذی الحجہ کا مہینہ بھی ملتا ہے۔ یقیناً بتانے والے نے انھیں دن اور تاریخ بھی بتانی ہوگی، جو وہ بھول گئے۔ لیکن جتنی معلومات میسر ہیں، یہ بھی کچھ کم نہیں۔

یکم ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ عیسوی تقویم کے لحاظ سے جمعات ۱۹ اگست ۱۸۸۸ء کو تھی۔ یہ مہینہ ۲۹ دن کا تھا، اسی کے ساتھ سال ۱۳۰۵ھ ختم ہو گیا۔ یکم محرم ۱۳۰۶ھ مطابق تھی، جمعہ ۱ ستمبر ۱۸۸۸ء کے اور ۱۱ نومبر ۱۸۸۹ء کہیں اتوار۔ ربیع الاول ۱۳۰۶ھ کو ہوئی۔ کہاں ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ اور کہاں ربیع الاول ۱۳۰۶ھ! یہ نہ ان کے تاریخی نام 'فیروز بخت'۔

۱- "انڈیا انس فرٹیم" ۲۰۱۲ء

۲- تذکرہ: ۳۱۱-۳۱۲

۳- میں نے تاریخوں کے لیے (INDIAN EPHEMERIS (A.D. 1800-2000)) ماخذ دیوان جواد سوامی

کنو پے استعمال کی ہے (مدراس-۱۹۱۵ء)

سے میل کھاتی ہے، نہ تاریخ ولادت (جواں بخت و جواں طالع، جواں باد) کے مطابق ہے۔ ان دونوں سے (۱۳۰۵ھ) برآمد ہوتے ہیں۔ پس، ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء بہر حال غلط اور ناقابل قبول ہے۔

مولانا غلام رسول قہر نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ مولانا آزاد نے ایک موقع پر خود انہیں اپنی صحیح تاریخ ولادت ۸ یا ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ بتائی تھی۔ انہوں نے اسے ۱۶ یا ۱۸ اگست ۱۸۸۸ء کے مطابق قرار دیا ہے۔ یہ اس جنتری کے مطابق ہوگا جو ان کے سامنے تھی۔ میں نے جس جنتری کا حوالہ دیا ہے اس کی رو سے یہ تاریخیں ۱۶ اور ۱۷ اگست کو پڑیں گی۔ ان تقابلی جنتریوں میں ایک آدھ دن کا تفاوت عام طور پر ملتا ہے۔ خود میں نے ایک مرتبہ مولانا مرحوم سے اس مسئلے سے متعلق بات کی تھی۔ انہوں نے کسی تاریخ کا تعین تو نہیں کیا، لیکن میں نے ان کے بتائے ہوئے کوائف سے اندازہ کیا تھا کہ وہ بدھ ۲۲ اگست ۱۸۸۸ء یعنی ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ کو پیدا ہوئے تھے اور یہ میں لکھ بھی چکا ہوں۔

غرض کہ وہ ۱۶/۱۸ اگست ۱۸۸۸ء کو پیدا ہوئے ہوں یا ۲۲ اگست ۱۸۸۸ء کو، ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء کو بہر حال نہیں ہوئے، یہ تاریخ یقیناً ٹھیک نہیں ہے۔ یقینی بات صرف یہ ہے کہ وہ ۹ اگست ۱۸۸۸ء کے درمیان کسی دن پیدا ہوئے اور ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء ان کی تاریخ ولادت نہیں ہے۔

۱۔ ماہنامہ "جامعہ" نئی دہلی، شمارہ فروری ۱۹۸۸ء : ۳۶

۲۔ ابوالکلام آزاد (احوال و آثار) مرتبہ: مسعود الحسن عثمانی : ۵۲

مولانا ابوالکلام آزاد

(پہلے بیس برس)

مولانا ابوالکلام آزاد کے بزرگ ہرات کے رہنے والے تھے۔ جہاں سے وہ بابر کے زمانے (۱۵۲۶-۱۵۳۰ء) میں ہندستان آئے۔ شروع میں وہ دارالخلافہ آگرہ میں رہے اور بعد کو غالباً اکبر کے عہد میں نقل مکان کر کے دلی چلے آئے!

یہاں ہمیں ان کے بزرگوں میں سب سے پہلا نام مولانا جمال الدین عرف شیخ بہلول دہلوی کا ملتا ہے۔ جن حضرات نے مولانا آزاد کی کتاب "تذکرہ" کا مطالعہ کیا ہے، انہیں معلوم ہوگا کہ دراصل یہ پوری کتاب انہیں مولانا جمال الدین کی سوانح عمری ہے۔ مولانا جمال الدین، اکبر کے ہم عصر تھے اور انہوں نے اس کی مذہبی بدعتوں اور اصلاحوں کی مخالفت کی تھی۔ ان کے حالات اس عہد کے بعض تذکروں میں ملتے ہیں۔

مولانا جمال الدین کے بیٹے شیخ محمد، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے مرید تھے۔ حضرت مجدد مدتوں جہانگیر کے معتب رہے تھے۔ اس کے باوجود شیخ محمد کا ان سے میل جول رکھنا

۱۔ انڈیا انس فرٹیم (انگریزی) : ۱

۲۔ مثلاً منتخب التواریخ، ۳ : ۱۱۳، اخبار الاخبار

اور بادشاہ وقت کی سیاست کی پروا نہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ آزاد رو اور دین کے معاملے میں بیخوف تھے۔

بعض لوگوں نے مولانا آزاد کے بزرگوں کا وطن قصور (ضلع لاہور) ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ قصور سے ان کا صرف اتنا تعلق تھا کہ مولانا آزاد کی دادی کے والد (یعنی مولانا خیر الدین کے نانا) مولانا منور الدین غالباً قصور میں پیدا ہوئے اور ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ بھی یہیں بسر ہوا تھا۔ مولانا منور الدین کے والد مولانا رشید الدین بھی دراصل ہرات ہی کے خاندان قضاہ میں سے تھے۔ اور مولانا رشید الدین کے والد بزرگوار مولانا صدر الدین وہاں شیخ طریقت کی حیثیت سے معروف تھے۔ گمان غالب ہے کہ مولانا آزاد کے بزرگوں اور مولانا رشید الدین کے خاندان کے آپس میں ہرات میں بھی تعلقات رہے ہونگے۔ قاضی رشید الدین، احمد شاہ ابدالی کے ساتھ پنجاب آئے اور یہاں انھوں نے قصور میں سکونت اختیار کر لی۔ احمد شاہ نے انھیں صوبہ لاہور کا قاضی القضاہ اور اپنے نائب السلطنت نور الدین کا مشیر مقرر کر دیا تھا۔ ان کے بیٹے منور الدین اپنی ابتدائی تعلیم لاہور میں ختم کرنے کے بعد سولہ سترہ سال کی عمر میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی شہرت سن کر دہلی آئے اور یہاں ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ مولانا آزاد نے خود لکھا ہے کہ مولانا منور الدین نے قصور سے دہلی تک کا یہ سفر بیشتر پیدل طے کیا تھا، بالخصوص سرہند سے دہلی تک کی مسافت۔ یہ اس لیے کہ اس زمانے میں پنجاب کی سیاسی حالت بہت مخدوش تھی، ہر طرف طوائف الملوک کی دور دورہ تھا۔ ایسے میں سواری کا انتظام کہاں ہو سکتا تھا۔ قرآن ایسے ہیں کہ یہ ۱۸۰۰-۱۸۰۱ کا زمانہ ہوگا، جب پنجاب میں سکھوں کی عملداری

۳ - تذکرہ: ۲۶ - آزاد کی کہانی (صفحہ ۳۷) میں ضلع آبادی نے مولانا منور الدین کے والد کا نام سراج الدین لکھا

ہے۔ یہ سہو ہوگا، تذکرہ کا نام ہی صحیح اور معتبر ہے۔

۴ - غالب: ۲۸۱؛ نقش آزاد: ۳۱۱-۳۱۲؛ آزاد کی کہانی: ۴۱-۴۲

۵ - آزاد کی کہانی: ۴۲

اور دلی کے نواح میں انگریزوں اور مرہٹوں کی باہمی آویزش کے باعث افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

مولانا منور الدین دلی آئے تو پھر چھ برس تک تعلیم کے سواے اور کسی چیز سے سروکار نہیں رکھا۔ اس اثنا میں ان کے والد تقاضی رشید الدین کا قصور میں انتقال ہو گیا۔ جب انھیں اس کی اطلاع ہوئی تو وہ قصور گئے اور خاندان کے بقیہ افراد کو ساتھ لوالائے اور اب مستقل طور پر یہاں دلی میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز کے مشورے سے یہیں دلی میں شادی کی۔ ان کی اولاد میں صرف دو لڑکیاں ہوئیں۔ بڑی کی شادی انھوں نے مولانا جمال الدین کے خاندان کے نام لیوا شیخ محمد ہادی سے کر دی۔ یہی شیخ محمد ہادی مولانا آزاد کے جد امجد تھے۔

غرض شجرہ نسب یوں ہے: مولانا ابوالکلام آزاد بن مولانا خیر الدین بن مولانا محمد ہادی بن شاہ محمد افضل بن مولانا محمد حسن۔ یہ سب بزرگ یہیں دلی کے رہنے والے تھے۔ پس جب وہ اپنے نام کے ساتھ دہلوی لکھتے ہیں، یا کہتے ہیں کہ "آہالی دطن دہلی مرحوم ہے" تو اس میں حق بجانب ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا جمال الدین عرف شیخ بہلول دہلوی جن کا ذکر اوپر ہوا انھیں مولانا آزاد کے پردادا شاہ محمد افضل کے نام نہالی سلسلے کے بزرگ تھے! مولانا منور الدین نے کرنے کو تو حکومت وقت کی ملازمت بھی اختیار کر لی، لیکن ملک کی عام طور پر اور شاہی خاندان کی خاص طور پر جو حالت سیاسی اور اخلاقی اس وقت تھی وہ اس سے سخت دل برداشتہ تھے۔ بالآخر انھوں نے غالباً ۱۸۵۵ء میں یہاں سے ہجرت کر کے حجاز چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بھوپال کے راستے سے بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ارادہ یہ تھا کہ وہاں سے بہار پر سوار ہونگے۔ بھوپال میں ان دنوں نواب سکنر بیگ حکمران تھے۔ وہ مولانا

۶ - تذکرہ : ۳۱

۷ - تذکرہ : ۲۵

۹ - ایضاً : ۳۱

۸ - ایضاً : نیز ص ۲۸۹

منور الدین کے وعظ اور پند و نصائح سے بہت متاثر ہوئیں۔ ہنوز یہ بھوپال ہی میں تھے، جب ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ (غدر) ہوا ہے۔ شورش فرو ہو جانے کے بعد یہ بمبئی پہنچے، لیکن آگے جانا نصیب نہ ہوا۔ پہلے علالت کی وجہ سے سفر جاری نہ رکھ سکے، بعد کو مریدوں نے جوش عقیدت میں روکے رکھا غرض اسی جیص بیص میں دو سال نکل گئے اور بالآخر ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ ۱۸۵۸-۱۸۵۹ء کا زمانہ سمجھنا چاہیے۔

مولانا آزاد کے جد امجد شیخ محمد ہادی نے بہت کم عمری (غالباً ۱۸۳۲-۱۸۳۵ء) میں وفات پائی۔ اس وقت مولانا آزاد کے والد بزرگوار مولانا خیر الدین صرف تین یا چار سال کے تھے؛ ان کا سال ولادت ۱۸۳۱ء ہے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت اپنے نانا منور الدین کی نگرانی میں ہوئی۔

جب مولانا منور الدین دہلی سے حج کے لیے روانہ ہوئے ہیں، تو یہ بھی نانا کے ساتھ تھے۔ ان کے بمبئی میں انتقال کر جانے کے بعد یہ حجاز گئے۔ چونکہ تعلیم ہندستان میں مکمل کر چکے تھے، اس لیے حجاز میں انھوں نے بعض علماء سے صرف اسناد کی تجدید کی۔ اسی سلسلے میں یہاں ان کی اس زمانے کے دو مشہور عالموں سے ملاقات ہوئی۔ شیخ عبداللہ سراج مکے میں اور شیخ محمد ظاہر وتری مدینے میں حدیث و فقہ کے درس و تدریس میں مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ مولانا خیر الدین ان اصحاب کی خدمت میں حاضری دینے لگے اور انھوں نے ان سے بہت استفادہ کیا۔

مولانا خیر الدین نے حجاز پہنچنے کے کوئی دس سال بعد (یعنی ۱۸۷۰-۱۸۷۱ء میں) وہیں

۱۰۔ انڈیا انس فرٹیم (انگریزی) : ۱

اس کے برخلاف "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ مولانا منور الدین کا "بمبئی میں دو سال قیام رہا، تیسرے سال مکہ مکرمہ پہنچے اور پانچ سال میں پانچ حج کیے وہیں انتقال کیا۔ اسی سال ہندستان میں غدر ہوا" (ص ۶۳) اس میں اور انڈیا انس فرٹیم کے بیان میں متعدد نمایاں اختلافات ہیں۔ میں ذاتی طور پر دوسری کتاب کو زیادہ معتبر خیال کرتا ہوں۔ میرے خیال میں ملیح آبادی سے سہو ہوا۔ (نیز اس سلسلے میں دیکھیے نقش آزاد: ۱۷۷)

۱۱۔ آزاد کی کہانی :

مدینے میں شادی کی^{۱۲}۔ یہ خاتون جن کا اسم گرامی عالیہ تھا، ان کے استاد شیخ محمد ظاہر دہری کی بھانجی تھیں۔ یہی مولانا آزاد کی والدہ ماجدہ تھیں۔ ان سے متعلق مختلف ذرائع سے کچھ مزید معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔

مدینے میں پوچھ گچھ سے پتہ چلا کہ ان کا خاندان دراصل مراکش کا رہنے والا اور مدتوں سے علم و ارشاد کا مرکز تھا۔ ان کے بزرگ ہجرت کر کے مدینے میں آئے تھے۔ یہ خود یہیں مدینے میں پیدا ہوئی تھیں۔ مولانا نے ان سے متعلق لکھا ہے کہ انھیں اپنے گھر کے علمی ماحول کے باعث تعلیم کا غیر معمولی موقع ملا۔ فنونِ عربیہ اور دینیات میں متوسط درجے تک کی قابلیت ضرور تھی۔ لیکن اردو اچھی طرح نہیں جانتی یا بول سکتی تھیں۔ حج کے موقع پر جو ہندوستانی عورتیں ان کی ملاقات کو آتیں، ان سے بات چیت کرنے کے لیے انھیں مترجم کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ مولانا آزاد نے ان کی دینی مسائل سے واقفیت کے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں^{۱۵} :

ایک مرتبہ ایک عورت نے جو ملتان سے آئی تھی، فرالض یعنی تقسیم ورنہ کا ایک نہایت پیچیدہ سوال کیا۔ انھوں نے ایک منٹ کے اندر غور کر کے اس کا جواب دے دیا۔ وہ جواب مجھے یاد ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ آج مجھ سے کوئی اس نوعیت کا سوال کرے، تو میں بغیر کاغذ پر حساب کرنے کے اس کا جواب نہیں دے سکتا۔

۱۲- آزاد کی کہانی : ۲۷

۱۳- میرے سامنے مولانا مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر ہے؛ اس میں انھوں نے جناب عبدالرشاد خان شیردانی (علی گڑھ) کے استفسار پر اپنے اور اپنے خاندان سے متعلق کچھ معلومات یہاں لکھیں۔ کئی تاریخوں اور ناموں کی تعیین اسی سے ہوئی، اس کا حوالہ جابجا 'غیر مطبوعہ تحریر' کے نشان سے دیا گیا ہے۔ یہ نام بھی وہیں ملا (ص ۵)

۱۴- غیر مطبوعہ تحریر : ۵-۶

۱۵- ایضاً ۱۶

مولانا خیر الدین کے ان خاتون سے پانچ بچے ہوئے۔ تین لڑکیاں اور دو لڑکے۔ لڑکیاں۔ زینب، فاطمہ اور حنیفہ (عرف محمودہ) تھیں اور لڑکے ابوالنصر غلام یسین اور ابوالکلام غلام محی الدین احمد یعنی ہمارے مولانا آزاد۔

میرا خیال ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی کنیت: ابوالنصر اور ابوالکلام ان کے نام کے ساتھ ہی ان کے والدین نے رکھی ہوگی، آج بھی عرب ممالک میں یہ عام رواج ہے کہ بچے کی کنیت کا بچپن ہی میں اعلان کر دیتے ہیں۔

حنیفہ سب سے چھوٹی کا تخلص آبرو تھا اور بھولی فاطمہ کا آرزو۔ سب سے بڑی زینب قسطنطنیہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ آبرو بیگم کا ذکر انھوں نے بہت جگہ کیا ہے۔ یہ ان کی بڑی ہمدرد اور غمگسار تھیں۔ ان کی شادی کلکتہ کے ایک صاحب احمد ابراہیم سے ہوئی تھی جو بعد کو خاندان کے پرانے تعلقات کے پیش نظر بھوپال میں ایک مقبول عہدے پر فائز ہو کر مستقلاً وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ آبرو بیگم کا جون ۱۹۴۳ء میں بھوپال ہی میں انتقال ہوا۔ آرزو بیگم کا بھی ۱۳ اپریل ۱۹۶۶ء کو ۸۲ سال کی عمر میں بھوپال میں انتقال ہو گیا۔ مولانا خیر الدین اپنی مذہبی اور دینی حیثیت کے باعث اپنے گھر اور اپنے مریدوں کے حلقے میں "حضرت" کے عرف سے مشہور تھے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کے بچپن میں یہ لوگ "چھوٹے حضرت" کہہ کر پکارتے تھے!۱۹

مولانا آزاد نے اپنی والدہ ماجدہ جناب عالیہ کی فیاضی اور سیرچسپی کا ایک دلکش واقعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:۲۰

ان کی اخلاقی اور دماغی سیرت پر اب میں جس قدر غور کرتا ہوں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے بلند درجہ کی تھی۔ وہ نہایت فیاض اور سیرچشم تھیں؛ غفلت اور مصیبت زدہ آدمیوں کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

۱۷۔ ہندستان ٹائمز، دلی، ۱۴ اپریل ۱۹۶۶ء : ۴

۱۹۔ غبارِ خاطر : ۹۹

۲۰۔ غیر مطبوعہ تحریر : ۶

۱۶۔ انڈیا ونس فریڈم : ۲

۱۸۔ آزاد کی کہانی : ۳۵۴

والد مرحوم نے ایک مرتبہ نہایت قیمتی دو شمالہ ان کے لیے منگوایا۔ جس دن انہوں نے اسے اوڑھا، اسی دن ام حبیب ان سے ملنے کے لیے آئی۔ یہ ایک غریب بیوہ تھی، جو ہمارے گھر سے قریب رہتی تھی۔ اس نے ایسا قیمتی دو شمالہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا پلہ ہاتھ میں لے کر نہایت طامع نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی، اور بار بار کہنے لگی کہ ایسی چیز ہم غریبوں کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ والدہ نے فوراً دو شمالہ کاندھے سے اٹھایا اور ان کے کاندھے پر ڈال دیا۔

انسان کی سیرت بچپن میں بنتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی وقتی باتیں اور کام جو انسان کم سنی میں کرتا ہے، دراصل یہی وہ بنیادی اینٹیں ہیں جن پر اس کے مستقل کردار کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اگر گھر کے بزرگ شروع میں بچوں کی لغزشوں کی نگرانی نہ کریں، تو یہی باتیں بار بار کرنے سے عادتِ راسخ بن کر بالآخر شخصیت کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ شروع میں بڑے بوڑھے چھوٹے بچوں کی شرارتوں اور بد عنوانیوں کو لاڈ چاؤ کے باعث انگریز کر لیتے ہیں، اور جب پانی سر سے گزرنے لگتا ہے، تو پھر شکایت کرنے لگتے ہیں، حال آنکہ اصلاح کا جو اصلی موقع تھا، وہ گنوا دیا، اب بچپانے سے کیا ہوتا ہے۔

مولانا آزاد نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے ان کی والدہ کے اخلاق کی بلندی اور پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

ایک شخص حافظ مبارک بخاری ہمارے یہاں رہتے تھے، وہ بہت اچھے خوشنویس تھے، اسی لیے والد مرحوم نے انہیں اپنی مصنفات کی تسمیض کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ چونکہ انہیں اپنے کپڑوں کی صفائی کا زیادہ خیال نہیں رہتا تھا، اس لیے میں نے ایک دن کہہ دیا کہ وہ بڑے گندے آدمی ہیں۔ والدہ نے جیسے ہی سنا، سنت برہم ہوئیں۔ اس وقت تک ان کی

باریک آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے: یا عیسیٰ لا تقبل ھکذا!

ترجمہ: اے اللہ! ہنس نہ لے۔ (یعنی میری جان، ایسا نہ

کہو۔ ہو سکتا ہے کہ خدا کی نظر میں وہ تم سے اور ہم سے عزیز تر ہو۔)

اسی طرح کا ایک واقعہ مولانا حالی نے سرسید کے بچپن سے متعلق لکھا ہے^{۲۲}۔

ایک اور جگہ انھوں نے اپنی والدہ کی فصاحت اور غیر معمولی قوتِ بیانیہ کے بارے میں اور
مکے کی عورتوں کے ان کے پاس عقیدت اور استفادے کی غرض سے آنے کا بھی ذکر
کیا ہے^{۲۳}۔

مولانا آزاد کے اپنے بیان کے مطابق، وہ ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں مکے میں پیدا ہوئے^{۲۴}۔

۱۳۰۵ھ کا ذوالحجہ ۹ اگست سے ۶ ستمبر ۱۸۸۸ء تک تھا۔ لہذا ہم کہیں گے کہ وہ اگست یا ستمبر ۱۸۸۸ء

میں پیدا ہوئے۔ چونکہ ذوالحجہ کی ٹھیک تاریخ معلوم نہیں ہے، اس لیے عیسوی مہینے کی تاریخ کا

تعیین بھی ممکن نہیں ہے^{۲۵}۔ تعجب ہوتا ہے کہ پروفیسر ہالیوں کبیر نے کیسے ان کی ولادت نومبر ۱۸۸۸ء

لکھ دی^{۲۶}۔ اور حکومت ہند کی طرف سے بھی جو تقریبات مولانا آزاد کی پیدائش کے سلسلے

میں ہوتی ہیں۔ ان کے لیے ۱۱ نومبر ہی کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے حال آنکہ نومبر کی

صورت میں ہجری سال ۱۳۰۶ھ ہو جاتا ہے۔ میرے علم میں خود مولانا آزاد نے اپنی تاریخ

ولادت تذکرہ کے سواے اور کہیں نہیں لکھی اور وہاں انھوں نے، صراحت سے ”ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ“

ہی لکھا ہے، جو اگست، ستمبر ۱۸۸۸ء کے مطابق ہے۔ پس نومبر ۱۸۸۸ء کی تاریخ کسی طرح
درست نہیں۔

۲۲ - حیات جاوید: ۱۹
۲۳ - آزاد کی کہانی: ۳۲۵-۳۲۶
۲۴ - تذکرہ: ۲۸۷

۲۵ - مولانا غلام رسول ہر فرماتے ہیں کہ ”خود مجھے مولانا سے جو معلوم ہوا، اس کی بنا پر میں نے تاریخ ولادت

۹ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ یعنی ۱۷ اگست ۱۸۸۸ء کی تھی۔“ (صبح، مارچ ۱۹۶۷ء، ص ۱۰) اس سلسلے میں ملاحظہ

ہو میرا مضمون جو اسی مجموعے میں شامل ہے۔

۲۶ - انڈیا ونس فریڈم (دیباچہ): ۸

مولانا آزاد کے والد نے مدینے میں شادی کر لینے کے بعد مکہ میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔ چونکہ دولت عثمانیہ کے قانون کے تحت کوئی غیر ملکی غیر منقولہ جاداد کا مالک نہیں ہو سکتا تھا اس لیے انھوں نے عثمانی جنسیت (نیشنلسٹی) اختیار کر لی تھی۔ یہ مکان جس قطعہ زمین میں بنا تھا، وہ دراصل مولانا عبد اللہ سراج کی ملکیت تھا۔ مولانا خیر الدین نے ان سے یہ ٹکڑا خریدا اور اس پر مکان بنا لیا۔ یہ مکے کے محلہ قدوہ میں باب السلام کے متصل تھا۔ اس کے کوٹھے کی کھڑکیوں سے حرم مکہ کے مناروں کی قندیلیں صاف نظر آتی تھیں۔ اور وہاں سے اذان کی آواز اتنی صاف اور بلند سنانی دیتی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اس مکان کی چھت پر سے اذان دے رہا ہو۔ اسی مکان میں مولانا آزاد پیدا ہوئے۔^{۲۹} یہ مکان بلدیہ مکہ کی تعمیری اور توسیعی سرگرمیوں کی نذر ہو گیا۔ اب یہاں ایک بڑی کشادہ سڑک ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مولانا آزاد غالباً ہندستان میں یاراپور میں پیدا ہوئے؛ یہ بے بنیاد ہے۔

مولانا آزاد کے بھائی ابوالنصر غلام یسین ان سے دو برس بڑے تھے، گویا وہ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ وہ کوئی چھ برس کے رہے ہونگے جب کہ ان کی تسمیہ خوانی ہوئی۔ اگرچہ مولانا اس وقت بہت کم عمر تھے، یہی کوئی چار ایک سال کی عمر ہوگی؛ لیکن جیسا کہ ایسی تقریبات میں پھوٹے بچے بالعموم کرتے ہیں، یہ بھی شوقیہ اس موقع پر بڑے بھائی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں کی تسلیم ایک ساتھ ہونے لگی، بلکہ ایک زمانہ تک ان کی تینوں بہنیں بھی ان کے ساتھ درس میں شامل رہیں، خاص کر فارسی میں۔

تعلیم متعدد اساتذہ سے حاصل کی فارسی بیشتر اپنے والد مولانا خیر الدین سے پڑھی، بقیہ علوم ان کے علاوہ دوسروں سے بھی۔ خود لکھتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم مکے میں شیخ محمد عمر اور شیخ حسن اساتذہ حرم سے پائی۔ تجاز میں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ بچپن میں یعنی حسانہ ان

۲۸۔ غبار خاطر : ۲۶۱

۲۹۔ غیر مطبوعہ تقریر : ۲

۳۰۔ غیر مطبوعہ تقریر : ۳

۲۶۔ آزاد کی کہانی : ۷۱

۲۹۔ تذکرہ : ۲۸۹

۳۱۔ آزاد کی کہانی : ۳۲

کے ساتھ ہندستان آنے سے پہلے وہ مدرسہ صولتیہ کے کسی استاد سے بھی پڑھتے رہے تھے۔ یہ مدرسہ مکہ میں مولانا محمد رحمت اللہ کیرانوی نے ۱۲۹۱ھ (۱۸۶۴-۶۱۸۶۵) میں قائم کیا تھا۔ ممکن ہے یہ دونوں استاد یا ان میں سے کوئی ایک اسی مدرسہ سے وابستہ رہے ہوں۔ قرآن انھوں نے یہیں ختم کیا۔ اس وقت ان کی عمر نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ بات موجودہ صدر مدرس (۱۹۶۸ء) صولتیہ مولانا سلیم سے ان لوگوں نے بیان کی تھی، جو مولانا کو بچپن میں جانتے تھے۔ ہندستان آنے کے بعد مختلف اوقات میں انھوں نے مولانا محمد یعقوب دہلوی^{۳۳}، مولانا محمد ابراہیم^{۳۴}، شمس العلماء، مولانا سعادت حسین^{۳۵}، مولانا محمد شاہ محدث رامپوری سے مختلف علوم میں نصاب کی کتابیں پڑھیں اور بالآخر معقولات وغیرہ کی تکمیل مولوی نظیر الحسن ایٹھوی سے کی^{۳۶}، جو مولانا عبدالحق خیر آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا خیر الدین نے انھیں کلکتہ بلا کے ان دونوں بھائیوں کی تعلیم پر مقرر کر دیا۔ یہاں وہ تین برس تک رہے تھے۔ مولانا خیر الدین ایک مرتبہ حجاز گئے تو پھر انھیں واپس وطن آنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ غالباً پہلی مرتبہ اپنے بعض گجراتی مریدوں کی درخواست پر حوج کے لیے گئے تھے، ۱۸۸۰ء میں حجاز سے بمبئی آئے اور پھر اس کے بعد وقتاً فوقتاً آتے رہے۔^{۳۷} جہاں تک کھوج لگا سکا ہوں، آخری مرتبہ وہ ۱۸۹۸ء میں ہندستان آئے۔ اس مرتبہ آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ مکہ میں ایک حادثے میں ان کی اُلٹی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہاں کوئی تسلی بخش علاج نہ ہو سکا اور انھیں مجبوراً ہندستان آنا پڑا۔ کلکتہ میں علاج کروایا گیا۔ اس سے وہ ٹھیک تو ہو گئے لیکن

۳۴ - ایضاً: ۱۹۲، ۲۱۰، ۳۶۵

۳۳ - آزاد کی کہانی: ۱۹۰

۳۶ - ایضاً: ۲۱۵، ۲۱۶

۳۵ - ایضاً: ۱۹۳

۳۷ - ایضاً: ۱۹۱ نیز غیر مطبوعہ تحریر: ۳ (میلج آبادی نے نام نذیر الحسن لکھا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ مولانا

نے خود نظیر الحسن لکھا ہے)

۳۹ - مولانا آزاد و مہادیو ڈیسی: ۱۱

۳۸ - آزاد کی کہانی: ۱۹۲

۴۰ - ایضاً نیز غیر مطبوعہ تحریر: ۱

بائیں ٹانگ چھوٹی رہ گئی، جس سے لنگ پیدا ہو گیا اور چلنے میں لکڑی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ ہندستان پہنچ کر دوسرا حادثہ یہ پیش آیا کہ ۱۸۹۹ء میں ان کی بیوی (یعنی مولانا آزاد کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ مانگ تلہ (کلکتہ) کے قبرستان میں دفن ہوئیں۔ مولانا خیر الدین نے ان کی قبر پر ایک خاص قسم کی سنگ مرمر کی عمارت تعمیر کروادی؛ اور اسی کے پہلو میں اپنی قبر کے لیے بھی جگہ رکھی۔ بعد کو خاندان کے متعدد دوسرے افراد بھی یہیں دفن ہوئے۔

آزاد بھی والدین کے ساتھ آئے تھے۔ ان کی تعلیم مکے میں شروع ہو چکی تھی؛ اب یہاں کے اساتذہ سے اس کی تکمیل کا انتظام کیا گیا۔ وہ ۱۹۰۳ء میں یعنی جب ان کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی، درس نظامی سے فارغ ہوئے۔ فاتحہ فراغ کی مجلس ہی میں سات طالب علم ان کے حوالے کر دیے گئے کہ انھیں پڑھائیں، ان کے قیام اور ضروریات کا انتظام مولانا خیر الدین نے کر دیا تھا۔ بعد کو ان کی تعداد بڑھ کر بیس تک پہنچ گئی۔^{۲۲}

ابھی تعلیم ختم نہیں ہوئی تھی کہ ۱۸۹۸/۱۸۹۹ء میں یعنی دس گیارہ برس کے سن میں انھیں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ ابتدا یوں ہوئی کہ ان کے گھر میں سینے پر رونے اور اوپر کے کام پر ایک مغلانی علیمہ نام کی ملازم تھی۔^{۲۳} وہ مہسرام کی رہنے والی تھی۔ اس کا عرف غالباً آمانی تھا؛ غبارِ خاطر کے ایک خط میں اسی نام سے اس کا ذکر آیا ہے۔^{۲۴} علیمہ کا بھائی عبدالواحد خان کبھی کبھی اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ یہ صاحب مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی کے شاگرد اور اچھے خاصے تعلیم یافتہ تھے۔^{۲۵} شعر بھی کہتے اور ادیب نخلص کرتے تھے۔^{۲۶} انھیں کی باتوں سے مولانا آزاد کو شعر گوئی کی ترغیب ہوئی۔ آزاد نخلص بھی عبدالواحد خان ہی نے تجویز کیا تھا۔ اس سے غرض یہ تھی کہ چونکہ گلدستوں میں شعرا کا کام ان کے نخلص کی اہمیت ترتیب سے پھیلتا ہوتا

۲۲ - آزاد کی کہانی : ۱۰۸

۲۳ - ایف : ۱۲

۲۴ - آزاد کی کہانی : ۲۳۰

۲۵ - آزاد کی کہانی : ۲۳۹

۲۱ - غیر مطبوعہ تحریر : ۱

۲۳ - غیر مطبوعہ تحریر : ۲

۲۵ - غبارِ خاطر : ۲۵۰

۲۶ - غیر مطبوعہ تحریر : ۱۲

اس لیے ان کا نام بالکل آغاز میں چھپا کر لگا۔ مولانا آزاد کی سب سے پہلی غزل بمبئی کے ایک گلدستے ارمنان فرخ میں چھپی تھی، طرح تھی: "پوچھی زمین کی، تو کہی آسمان کی"۔ مولانا نے اس پر گرہ لگا کر اسے مقطع کر دیا:

آزاد بخودی کے نشیب و فراز دیکھ
"پوچھی زمین کی، تو کہی آسمان کی!"

مولانا آزاد نے شروع میں دو غزلیں اصلاح کے لیے منشی امیر مینائی کی خدمت میں بھیجیں،^{۴۹} لیکن ان کی اصلاح انھیں کچھ پسند نہیں آئی؛ اس پر انھوں نے دوسرے استاد وقت داغ دہلوی سے رجوع کیا؛ یہ سلسلہ بھی زیادہ دن تک نہ چل سکا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انھوں نے امداد حسین ظہور میرٹھی سے بھی مشورہ کیا کیونکہ ان کی ایک نعت جو بمبئی کے رسالے سفینہ نجات کے اپریل ۱۹۰۰ء کے شمارے میں شامل ہے، اس کے عنوان میں ان کے نام کے ساتھ شاگرد مولانا امداد حسین ظہور میرٹھی لکھا ملتا ہے۔^{۵۰} اس کے بعد ان کی نظر مولانا ظہیر احسن شوق نیوی پر پڑی جو علم اور واقفیت فن کے لحاظ سے اپنے معاصرین پر بدرجہا فوقیت رکھتے تھے۔ ان سے یہ پورے طور پر مطمئن رہے، اور پھر جتنے دن شاعری کی اصلاح انھیں سے لی۔^{۵۱} اس اثنا میں کبھی کبھی فارسی میں بھی کہنے کا شوق رہا۔ بسبیل تذکرہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ان کی دیکھا دکھی، ان کے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یسین نے آہ تخلص اختیار کیا۔ وہ داغ ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ مقامی مشاعروں میں شرکت کے علاوہ ان کا کلام بھی گلدستوں میں چھپنے لگا۔ انھوں نے نثر میں بھی کچھ مضامین اور دو ایک کتابیں بھی لکھیں۔^{۵۲} بہر حال مولانا آزاد کی شاعری کی مدت یہی دو تین برس کے قریب ہے۔

۴۹ - ایضاً

۵۰ - غیر مطبوعہ تحریر: ۱۳

۵۱ - اردو (کراچی)، اکتوبر ۱۹۶۶ء: ۵۰

۵۲ - آزاد کی کہانی: ۳۴۲

۵۳ - ان کے حالات اور کلام کے لیے دیکھیے آزاد کی کہانی، ۱۶۸-۱۸۵، خم خانہ جاوید: ۱۱۴؛ نیز آجکل (دہلی)

اپریل ۱۹۶۲ء: ۳-۴ (اس مجموعے میں ایک مفصل مضمون ان سے متعلق شامل ہے)

اس کے بعد دوسری سرگرمیوں اور کوششوں کے مقابلے میں یہ شوق ترک ہو گیا۔ ان کا اردو اور فارسی منظم کلام جو ملتا ہے۔ دو ڈھائی سو شعر سے زیادہ نہیں ہوگا۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اتنی قلیل مدت کی شاعری اور اتنی کم سنی میں بھی انہوں نے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ اتنی ۱۹۰۱ء میں انہوں نے مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی کی کتاب ”تذکرہ صادق یعنی الدر المنثور فی تراجم اہل صادق فور“ کے لیے جو تقریظ لکھی، ناشر نے اس کے عنوان میں لکھا تھا: ^{۵۴}

ریویو بر کتاب مستطاب تذکرہ صادق از مجمع فضائل و محاسن، شاعر باکمال سخور

بیشال، مولوی ابوالکلام محی الدین احمد صاحب آزاد دہلوی مقیم کلکتہ

صَانَهُ اللهُ مِنْ شَرِّ الْحُسَّادِ

یاد رہے کہ اس وقت ان کی عمر کسی طرح ۱۳ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

شاعری تو چھٹ گئی لیکن اس کا شاخسانہ صحافت کی شکل میں نمودار ہوا۔ جس نے آگے چل کر مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ ہوا یہ کہ انہیں خیال ہوا کہ ایک ماہانہ گلہ دستہ نکالا جائے۔ یہ گویا اپنی شاعری کی تکمیل کا ایک ذریعہ تصور کیا گیا۔ چنانچہ مقامی اور بیرونی شعرا سے غزلیں جمع کی گئیں۔ اس گلہ دستہ کا نام نیرنگ عالم تھا، اور یہ ہادی پریس کلکتہ میں چھپتا تھا۔ یہ پرچہ ۱۸۹۹ء کے آغاز میں نکلا۔ اور سال کے اندر ہی بند بھی ہو گیا، صرف آٹھ مہینے جاری رہا۔ ^{۵۵}

اس کے بعد انہوں نے ایک شخص محمد موسیٰ سے بات چیت کر کے ہفتہ وار المصباح جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ ان کے بقول ^{۵۶} ٹھیک عید الفطر کے دن شائع ہوا، اس میں انہوں نے ادارہ ’عید‘ کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ ادارہ غالباً بعض دوسرے اخباروں میں بھی نقل ہوا تھا۔ بیسہ اخبار لاہور کا نام تو خود مولانا ہی نے لکھا ہے۔ اگرچہ انہوں نے المصباح کی اشاعت کی

۵۵۔ آزاد کی کہانی : ۲۴۳

۵۴۔ اردو ادب (آزاد نمبر) : ۳۳ - ۳۴

۵۶۔ ایضاً : ۲۵۷

تاریخ اواخر سال ۱۹۰۰ء لکھی ہے، لیکن یہ سہو ہے۔ اس لیے کہ رمضان کی پہلی بیشک ۲۳ دسمبر ۱۹۰۰ء کو تھی، لیکن عید الفطر منگل کے دن ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو ہوئی تھی اس لیے المصباح کا پہلا شمارہ بھی اسی موقع پر شائع ہوا ہوگا۔ نیرنگ عالم گلدستہ تھا اس میں ایڈیٹر کا کام برائے نام تھا یعنی باہر سے آئی ہوئی غزلوں کو جمع کر کے شائع کر دینا۔ پہلا پرچہ جو مولانا آزاد نے ٹھیک طور پر مرتب کیا، وہ یہی المصباح تھا۔ یہ اخبار بھی تین چار مہینے سے زیادہ نہیں چلا۔^{۵۷}

اس وقت تک مولانا آزاد کی سب سے قدیم کتابی شکل میں شائع شدہ تصنیف جو میری نظر سے گزری ہے اس کا عنوان ہے "اعلان الحق" اس میں انھوں نے اپنے والد مولانا خیر الدین کے مخالفوں کو ایک مسئلہ سے متعلق جواب دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا خیر الدین نے رویت ہلال رمضان اور عید کے بارے میں یہ فتویٰ دیا تھا کہ اگر مشرق میں کسی جگہ چاند دکھائی دے اور شرعی شرط پوری ہو جائیں، تو وہاں سے تار وغیرہ کے ذریعے سے رویت کی اطلاع ملنے پر مغرب والوں پر لازم ہے کہ اس کے مطابق روزہ رکھیں یا عید کریں۔ مخالفت علما نے اس پر نہ صرف اعتراض کیا، بلکہ اس کی آڑ میں مولانا خیر الدین کی مخالفت شروع کر دی۔ مولانا آزاد نے اس رسالے میں انھیں مخالفوں کے دلائل کا رد کیا ہے۔ یہ مختصر رسالہ ۲۵ رمضان ۱۳۱۹ھ یعنی ۵ جنوری ۱۹۰۲ء کو شائع ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ برس اور چار پانچ مہینے کے قریب تھی۔

اسی رسالے کے آخر میں ان کے ایک دوسرے رسالے "ہدایت الرشید" کا اشتہار بھی ہے۔ خیر یہ توجہ معترضہ تھا۔

کہ چکا ہوں کہ تین چار مہینے جاری رہ کر المصباح بھی اپریل / مئی ۱۹۰۲ء میں بند ہو گیا۔ اب اس کے بعد ان کا اپنا کوئی پرچہ نہیں رہا۔ لیکن جو خون منہ کو لگ چکا تھا، اس سے چھٹکارا بھی مشکل تھا۔ چنانچہ انھوں نے مختلف رسالوں اور پرچوں میں مضامین لکھنا شروع کیے۔

ان میں مخزن، لاہور؛ احسن الاخبار، کلکتہ؛ تحفہ احمدیہ، کلکتہ؛ مرتب عالم ہر دوئی وغیرہ کے نام ہمیں معلوم ہیں۔ اسی دور کا ایک مشہور ماہنامہ خدنگ نظر تھا جسے ستمبر ۱۸۹۶ء سے منشی نوبت علی نظر نکالتے تھے۔ اس میں نظم و نثر دونوں تھے۔ مولانا آزاد نے نظر کو لکھا کہ آپ اس میں نثر کا حصہ بڑھا دیجیے اور میں اس کی ترتیب میں آپ کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہوں۔ چنانچہ یہ انتظام نظر نے قبول کر لیا۔ اور کچھ مدت تک اس کے حصہ نثر کی ترتیب و تدوین ان کے ذمے رہی۔ اس رسالے میں خود مولانا آزاد کا کلام اور نثری مضمون بھی چھپتے رہے۔ انھیں میں ایک مضمون "عکس ریز" کے موضوع پر تھا جسے دیکھ کر مولانا شبلی نے ان سے کہا تھا کہ اس طرح کا کم از کم ایک مضمون الندوہ کے ہر شمارے کے لیے لکھ دیا کیجیے۔ بالآخر یہی چیز ان کے الندوہ کے نائب مدیر بننے میں بھی معاون ہوئی۔

۱۹۰۰-۱۹۰۱ء میں ان کی شادی کر دی گئی تھی۔ ان کے والد کے ایک بہت مخلص مرید مولوی آفتاب الدین صاحب تھے۔ وہ وہیں کلکتہ میں سروے آفس میں ملازم تھے؛ انھوں نے طویل ملازمت کے بعد اسی دفتر سے پنشن پالی۔ ان کے پانچ لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک کا نکاح انھوں نے ابوالنصر غلام حسین اور دوسری کا مولانا آزاد سے کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر یہی ۱۲-۱۳ سال کے لگ بھگ تھی اور ان کی بیوی کی سات آٹھ سال کی۔ مولانا آزاد کی بیوی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں، ان کا نام زینب تھا۔ انھوں نے اردو فارسی کی تعلیم پوری طرح حاصل کی تھی اور عربی کی مبادیات سے آشنا تھیں؛ مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اولاد میں صرف ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا چار برس کی عمر میں انتقال ہو گیا چونکہ وہ بہت خوبصورت تھا، اس لیے اس کا نام حسین رکھا تھا۔ بیگم آزاد کا تپ وق سے ۹ اپریل ۱۹۲۲ء

۵۹ - ابوالکلام آزاد : ۲۰۳

۶۱ - آجکل ستمبر ۱۹۵۵ء : ۱۵

۶۲ - غیر مطبوعہ تقریر : ۷

۵۸ - ایضاً : ۳۸۰

۶۰ - ذکر آزاد : ۲۲۵-۲۲۶

۶۳ - غبارِ خاطر : ۲۳۵

۶۴ - ایضاً : ۱۱

کو کلکتہ میں انتقال ہوا۔^{۶۵}

لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۰۳ء میں وہ تعلیم سے فارغ ہوئے جو زندگی کا بہت بڑا مرحلہ ہے۔ ۱۹۰۳ء ہی کا دوسرا اہم واقعہ "لسان الصدق" کا اجرا کیا۔

مولانا آزاد دس سال کی عمر سے نظم و نثر لکھ رہے تھے؛ ان کی تحریریں کلکتہ وغیرہ کے رسائل و جرائد میں شائع ہو رہی تھیں اور اس سے ان کی شہرت میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی شہرت کل ہند تھی یا وہ لوگ جن کی رائے کی واقعی کوئی وقعت یا اہمیت تھی؛ ان تک بھی یہ تحریریں پہنچ رہی تھیں۔ یہ کام "لسان الصدق" نے کیا۔ یہ واقع ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد ملک کے علمی اور ادبی حلقوں کو معلوم ہوا کہ صحافت کے افق پر ایک نیا ستارہ ابھرا ہے۔ اور ستارہ بھی کیسا کہ دیکھتے دیکھتے اس کی تیز روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

ستارہ بدرخشید و ماہ مجلس شد

"لسان الصدق" کا پہلا شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا۔ یہ پرچہ ایسا مقبول ہوا کہ اس کی دھوم مچ گئی۔ ملک کے مشہور جرائد مثلاً "کیل امرتسر"؛ "پیسہ اخبار لاہور" وغیرہ میں اس پر بہت اچھے تبصرے شائع ہوئے۔ مضمونوں کا معیار اتنا بلند اور طرزِ تحریر ایسا دلکش تھا کہ لوگوں نے اس کے مدیر کو کوئی معمر عالم خیال کیا۔

بیجا نہ ہوگا اگر "لسان الصدق" کے چار مقاصد جو اس کے پہلے شمارے میں چھپے تھے، یہاں بیان کر دیے جائیں۔

- ۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔
- ۲۔ ترقی اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔
- ۳۔ علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگلہ میں۔

۶۵۔ غبارِ خاطر؛ ۲۴۰؛ ذکرِ آزاد (ص ۲۲۹-۲۳۰) میں تاریخ وفات ۱۹ اپریل چھپی ہے۔ یہ سہو کتابت ہے؛ صحیح ۱۹ اپریل ہے۔

۴۔ تنقید یعنی اردو مصنفات پر منصفانہ ریویو کرنا۔

ذرا مدیرِ اعلیٰ کی عمر کا خیال کیجیے اور ان بلند بانگ مقاصد کا! انگریزی کی مثل ہے کہ آنے والے واقعات کی پرچھائیاں پہلے سے دکھائی دینے لگتی ہے؛ اس مثل کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ اسی رسالے کی شہرت ان کے انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے اجلاس ۱۹۰۴ء میں شرکت کا باعث ہوئی۔ یہ اجلاس یکم اپریل سے ۳ اپریل تک لاہور میں ہوا تھا۔ اسی موقع پر مولانا آزاد کی پہلی مرتبہ مولانا حالی سے ملاقات ہوئی، جو جلسے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ مولانا آزاد یہاں پہلے مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی سے ملے۔ سلیم کو جب معلوم ہوا کہ یہی سان الصدق کے مدیر ہیں، تو انھوں نے تعجب کیا۔ وہ ایک عجوبے کے طور پر انھیں مولانا حالی سے ملانے کو لے گئے۔ وہاں پہنچے تو سلیم نے ان کی طرف اشارہ کر کے مولانا حالی سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ان کی کیا عمر ہوگی؟ حالی نے اپنے محتاط اور سنجیدہ انداز میں تامل سے فرمایا: ابھی بہت کم سن ہیں۔ لیکن جب سلیم نے اصرار کیا کہ نہیں بتلایے کیا عمر ہے؟ تو کہا کہ کوئی پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ جب سلیم نے بتلایا کہ سان الصدق کے مدیر یہی ہیں، تو یہی تعجب کیا۔ پھر اس دن جو تعلقات قائم ہوئے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ وہ استوار ہوتے چلے گئے۔^{۶۶}

سان الصدق کے ایک اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا لاہور سے بمبئی گئے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب ان کی آغا حشر کاشمیری اور علی خان سے ملاقات ہوئی، جن کے ساتھ مل کر انھوں نے اسلام کی مدافعت میں آریہ سماج کے پرچار کول اور عیسائی مشنریوں سے مناظرے کیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مختلف مذاہب اور ان کی کتب مقدسہ سے متعلق وسیع واقفیت

۶۶۔ اس واقعے کی پوری تفصیل کے لیے دیکھیے: آزاد کی کہانی: ۳۰۸-۳۱۰۔ البتہ کہانی میں سال غلطی سے ۱۹۰۳ء لکھا گیا ہے۔ حال آنکہ یہ واقعہ ۱۹۰۴ء کا ہے۔

۶۷۔ شمارہ جون جولائی ۱۹۰۳ء یہاں بمبئی میں ان کا پتہ تھا: ۱۳ بلاس روڈ ہالی کلمہ

۶۸۔ آزاد کی کہانی: ۳۳۴-۳۳۵

حاصل ہوگئی، جو بعد کے زمانے میں بہت کام آئی۔ بمبئی میں وہ کافی زمانہ رہے۔ لسان الصدق کے کچھ شمارے انہوں نے مرتب کر کے وہیں سے شائع کیے تھے۔

لسان الصدق بھی اپنے پیشرووں (نیرنگ عالم اور المصباح) کی طرح زیادہ دن تک نہ چل سکا، اگرچہ ان کی بہ نسبت یہ زیادہ سخت جان ثابت ہوا۔ نومبر ۱۹۰۳ء میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا تھا، اور اگلے مہینے دسمبر میں دوسرا۔ پہلی جلد میں بس یہی دو پرچے نکلے، نومبر و دسمبر جنوری ۱۹۰۴ء سے دوسری جلد کا آغاز ہوا۔ لیکن سال بھر میں صرف نو شمارے شائع ہو سکے؛ اس جلد کا آخری پرچہ اگست/ستمبر کا مشترکہ شمارہ (نمبر ۸-۹) ہے اس کے بعد ۱۹۰۴ء میں کوئی پرچہ شائع نہیں ہوا، بلکہ ۱۹۰۵ء کی پہلی سہ ماہی بھی خالی گئی۔ اپریل/مئی ۱۹۰۵ء کے مشترکہ شمارے پر جلد ۳ کا نمبر ۲ ثبت ہے۔ یہ پرچہ آگرے کے مشہور مفید عام پریس میں چھپا تھا۔

اواخر دسمبر ۱۹۰۴ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا۔ دراصل اس سال جلسہ پٹنہ میں کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا، لیکن اجلاس کے ایام میں وہاں طاعون پھیل گیا، اس پر یہ پٹنہ کی جگہ لکھنؤ میں کیا گیا۔ پرنسپل دارالعلوم سر تھیوڈور مارین اس اجلاس کے صدر تھے، مولانا آزاد اور ان کے برادر بزرگ مولانا ابوالنصر آہ دونوں اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کانفرنس کے ساتھ ہی مسلم پریس کانفرنس کا دوسرا سالانہ جلسہ بھی ۳۰ دسمبر ۱۹۰۴ء کو منعقد ہوا تھا۔ ایک اردو پریس کانفرنس کے قیام کا خیال مشہور پیسہ اخبار والے منشی محبوب عالم کو ۱۸۹۵ء میں آیا تھا۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا اور بالآخر ایک عام کانفرنس کا دعوت نامہ ملک بھر کے صحافیوں اور اخبار نویسوں کو بھیجا گیا۔ مئی ۱۸۹۶ء میں یہ جلسہ ہوا، بدقسمتی سے لاہور سے باہر کے لوگوں نے پورا تعاون نہ کیا، صرف دو ایڈیٹر جلسے میں شرکت کے لیے پہنچے۔ اس پر منشی محبوب عالم مایوس ہو کر خاموش ہو گئے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مولانا آزاد ۱۹۰۳ء میں عارضی طور پر

۶۹۔ مرقع کانفرنس: ۱۰۱

۶۰۔ خطبہ صدارت کے لیے دیکھیے خطبات عالیہ (۱): ۲۴۱-۲۵۸

ایڈورڈ گزٹ شاہجہان پور کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک شذرہ اس پریس کانفرنس سے متعلق اپنے اخبار میں لکھا۔ اس میں انھوں نے منشی محبوب عالم کو توجہ دلائی کہ ان کی پریس کانفرنس سے متعلق تجویز بہت مفید اور وقت کی ضرورت تھی انھیں چاہیے کہ اس کانفرنس کو پھر سے زندہ کر کے اسے فعال جماعت بنائیں۔ منشی محبوب عالم نے یہ شذرہ اپنے اخبار میں نقل کیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اس سال یعنی ۱۹۰۳ء کے اواخر میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تو اسی کے ساتھ ”مخبر پریس ایسوسی ایشن“ کا بھی جلسہ ہوا۔ کانفرنس کے سلسلے میں ملک بھر کے مسلمان ایڈیٹر اور تعلیم یافتہ طبقے کے چیدہ اصحاب تو موجود ہی تھے، جلسہ کرنے میں کون سی مشکل تھی، لیکن جلسے کے بعد کی بے نمکی بھی دیکھنے کی چیز تھی۔

اب کے جو لکھنؤ میں کانفرنس کا اجلاس ہونے والا تھا، تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میر پھیر آواز اٹھائی گئی۔ منشی محبوب عالم صاحب سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ پریس ایسوسی ایشن کے سلسلے میں بھی کوئی قدم اٹھائیں۔ لیکن صدائے برنخاست۔ بلکہ منشی محبوب عالم صاحب لکھنؤ کانفرنس میں شرکت تک کے لیے نہیں آئے۔ تو یہ تھا پس منظر اس مسلم پریس کانفرنس کا جس کا ابھی ذکر کیا گیا۔ اب کے اس کے روح ورواں حاجی ریاض الدین بریلوی ایڈیٹر الریاض تھے۔

اس جلسے میں متعدد اخبار و رسائل کے ایڈیٹروں کے علاوہ کوئی ۵۰ کے قریب معززین نے بھی حصہ لیا۔ اس موقع پر مسلم پریس کانفرنس کو مستقل ادارہ بنانے کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر بہت تفصیلی اور گرم بحث ہوئی۔ اس بحث میں حصہ لینے والوں میں خواجہ غلام الثقلین، ایڈیٹر عصر جدید، میرٹھ، مولوی بشیر الدین، ایڈیٹر البشیر، اٹاوا، منشی جمال احمد، ایڈیٹر ہمدرد کٹرا (الآباد)، حاجی ریاض الدین احمد بریلوی، ایڈیٹر الریاض وغیرہ کے ساتھ مولوی ابوالکلام آزاد، ایڈیٹر سان الصدق کلکتہ کا نام بھی بہت نمایاں ہے۔^{۴۱}

۴۱۔ سان الصدق، اپریل، مئی ۱۹۰۵ء : ۲۳

۴۲۔ یہ تمام تفصیلات سان الصدق، اپریل، مئی ۱۹۰۵ء (ص ۲۲-۲۶) سے لی گئی ہیں۔

اس مسلم پریس کانفرنس کے انعقاد کے بعد مولانا آزاد نے جو خیالات ظاہر کیے تھے، شاید وہ دلچسپی سے سنے جائینگے۔ لکھتے ہیں:

اب رہی یہ بحث کہ پریس کانفرنس کا یہ دوبارہ قیام کہاں تک کامیاب ہوگا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہ ہم کو اس کی پہلی کارروائی پر اطمینان ہے، اور نہ صرف ہم کو بلکہ کسی ذی فہم شخص کو ان جلسوں پر جو بلا مبالغہ بچوں کا کھیل ہے، اطمینان ہو سکتا ہے؛ لیکن چونکہ ایسی حالت میں کوشش اور امید سے دست بردار ہونا نتیجہ موہوم کا گمان بھی مٹا دیتا ہے۔ اس لیے سردست ہم اس کے متعلق کوئی رائے نہیں دیتے۔ سو اس کے کہ آئندہ کارروائیوں کا انتظار کریں اور دیکھیں کہ جدید سکرٹری کی کوشش کی نتائج پیدا کرتی ہے۔

چند فقرہوں کی اس مختصر سی تحریر میں جو خود اعتمادی، معاملہ فہمی اور دور بینی لفظوں کا پردہ چاک کر کے جھانک رہی ہے، کیا یہ ایک سولہ سالہ نوجوان کے قلم سے باعثِ استعجاب ہے یا نہیں؟ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولانا آزاد کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ مسلم پریس کانفرنس اس ابتدائی جلسے کے بعد ابدی نیند سو گئی، جیسا کہ کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اپریل مئی ۱۹۰۵ء کے مشترکہ شمارے کے بعد لسان الصدق کا اور کوئی پرچہ شائع نہیں ہوا۔ اس کے فوراً ہی بعد وہ عراق کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ پورا واقعہ کچھ یوں معلوم ہوتا ہے۔

ایک صاحب تھے حافظ عبدالرحمن امرتسری، بڑے جہانیاں جہانگرد؛ اسی باعث وہ سیاح ممالک اسلامیہ کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کی ملاقات کہیں مولانا آزاد کے بڑے بھائی

۴۳۔ ایضاً: ۲۴-۲۵

۴۴۔ آزاد کی کہانی: ۳۱۱ یہاں اس سفر کی تاریخ ۱۹۰۴ء درج ہے، یہ غلط معلوم ہوتی ہے؛ صحیح ۱۹۰۵ء ہوگی اور وہ بھی اپریل کے بعد۔

مولانا ابوالنصر آہ سے ہو گئی۔ آہ کو اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ آہ نے حافظ عبدالرحمن کے ساتھ عراق جانے کا منصوبہ بنایا، مولانا آزاد بھی ساتھ ہو لیے۔ چنانچہ یہ قافلہ بغداد پہنچا۔ مولانا آزاد یہاں پہنچتے ہی بہت بیمار پڑ گئے، اور بالآخر واپس بمبئی چلے آئے۔ آہ اور حافظ عبدالرحمن آگے بڑھے اور موصل اور دیار بکر اور شام تک گئے۔ یہیں شدید سردی کے باعث آہ کے پھیپھڑوں پر حملہ ہوا۔ مولانا آزاد شاکی ہیں کہ ان کے رفیق سفر حافظ عبدالرحمن امرتسری صاحب نے بھی کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ اسی بیماری کی حالت میں وہ واپس بغداد آئے۔ یہاں ان دنوں برطانوی قنصل خانے میں منجملہ اور اصحاب کے اردو کے مشہور مصنف (بلکہ ہمارے ہاں رومانی تحریک کے بانیوں میں سے) سید سجاد حیدر یلدرم بھی ملازم تھے۔ انھوں نے بہت مدد کی۔ قصہ کوتاہ آہ بہت زار و خجیف حالت میں واپس بمبئی پہنچے۔ یہاں ان کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ مولانا خیر الدین بیٹے کی علالت کی خبر سن کر بمبئی پہنچے اور انھیں علاج کے لیے اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے، لیکن بیسود، ۱۹۰۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مانک تلہ کے خاندانی حصہ قبرستان میں مدفون ہیں۔

۱۹۰۵ء کے شروع میں مولانا شبلی بمبئی آئے۔ وہ ان ایام میں حیدرآباد میں ناظم سررشتہ علوم و فنون کے عہدے پر فائز تھے۔ مولانا آزاد کی ان سے تین چار برس سے خط و کتابت تھی، لیکن ملاقات پہلی مرتبہ یہیں بمبئی میں ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے مقام شناس ہو گئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا مشہور رسالہ 'الندوہ' جاری ہو چکا تھا۔ اور مولانا شبلی ہی اس کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد سے کہا کہ اگر آسکو تو 'الندوہ' کی ترتیب اشاعت

۷۵۔ ایضاً: ۱۷۹

۷۶۔ ایضاً: ۱۸۰ میں سال وفات ۱۹۰۷ء لکھا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ ان کا انتقال وسط ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ ان کی وفات پر مقبول حسین وصل بگرامی نے اپنے پرچے عالمگیر کے اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔

اپنے ہاتھ میں لے لو۔ لیکن اس وقت مولانا آزاد کسی باعث یہ پیشکش قبول نہ کر سکے۔

مولانا شبلی چند دن کے قیام کے بعد حیدرآباد چلے گئے۔ دراصل انہوں نے حیدرآباد کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور اگرچہ مدارالمہام یعنی وزیراعظم نے اسے منظور کر لیا تھا، ہنوز اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ جب یہ حیدرآباد پہنچے، تو یہ تصدیق بھی مل گئی اور وہ فروری ۱۹۰۵ء کے آغاز میں حیدرآباد سے پہلے اپنے وطن اعظم گڑھ اور وہاں سے لکھنؤ آگئے۔ یہاں سے انہوں نے مولانا آزاد کو دوبارہ دعوت دی کہ آئیے اور الندوہ کو سنبھال لیجیے۔ اب کے انہوں نے اسے منظور کر لیا۔ اور لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں ان کا قیام مولانا شبلی ہی کے ساتھ رہا۔ دن رات کا ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ شبلی بھی اپنے مطالعے اور وسعتِ نظر اور ترقی پسندانہ خیالات میں ایک فرد تھے۔ مولانا آزاد نے یقیناً ان کی صحبت سے بہت فائدہ اٹھایا۔ وہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک چھ مہینے الندوہ کے ادارہ تحریر سے منسلک رہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے الندوہ سے کیوں قطع تعلق کیا۔ خود انہوں نے لکھا ہے کہ ”بہمی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہوا اور بہمی چلا آیا۔ یہ واقعہ کیا تھا اور اس کا ان سے کیا تعلق تھا“ ہمیں اس کی کوئی اطلاع نہیں۔ بہر حال وہ مارچ ۱۹۰۶ء میں الندوہ سے قطع تعلق کر کے بہمی چلے گئے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں کے دوران میں ان کا تعارف وکیل، امرتسر کے مالک شیخ غلام محمد سے ہو چکا تھا، جو اپنے زمانے کا مشہور اخبار تھا۔ یہ ہفتے میں تین مرتبہ شائع ہوتا تھا اور ملک میں اس کی رائے اور پالیسی کی بہت قدر تھی۔ لاہور سے واپسی کے بعد وہ وکیل کے لیے مضمون بھی لکھنے لگے تھے۔ اب جو الندوہ کا تعلق باقی نہ رہا، تو شیخ غلام محمد نے انہیں لکھا کہ اگر آپ چاہیں تو یہاں آجائیے اور وکیل کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیجیے۔ چنانچہ یہ بہمی سے پہلے لاہور اور پھر وہاں سے اپریل ۱۹۰۶ء میں امرتسر پہنچ گئے۔ یہاں آنے کے کچھ مدت بعد ان کے بڑے بھائی

۷۷۔ حیاتِ شبلی : ۴۰۸ - ۴۰۹

۷۸۔ آزاد کی کہانی : ۳۱۷

مولانا غلام یسین آہ کا انتقال ہو گیا۔ جنہیں ان کے والد دراصل اپنی جانشینی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ اور جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے، وہ بھی مذہبی عقائد میں، وعظ و تذکرہ کے طور طریقے، چال ڈھال، وضع و کردار غرض تمام باتوں میں اپنے والد کے قدم بقدم تھے۔ ان کی جوان مرگی کا مولانا خیر الدین کو صدمہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ اب ان کی امیدوں کا سہارا لے لے کے مولانا آزاد کی ذات رہ گئی۔ بھائی کے انتقال کی خبر سن کر یہ پہلے ہی دل برداشتہ ہو رہے تھے۔ والد نے خط لکھا اور پھر انہیں لانے کو آدمی امرتسر بھیج دیا۔ چنانچہ یہ نومبر ۱۹۰۶ء میں وکیل سے قطع تعلق کر کے کلکتہ چلے گئے۔ یوں گویا یہاں تقریباً سات مہینے وکیل کے ایڈیٹر رہے۔ گمان غالب ہے کہ والد نے ضرور انہیں اپنے مسلک پر ڈھالنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن یہ بہت پہلے سے کچھ گھر کے محدود اور قدامت پسندانہ ماحول کی وجہ سے، اور کچھ سرسید احمد خان کی تصنیفات کے اثر سے بالکل آزاد خیال ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ کسی طرح ان کے امتحان پر پورے نہیں اتر سکتے تھے۔ یہاں کلکتہ میں وہ چندے ایک ہفتہ دار اخبار 'دار السلطنت' کے ادارہ تحریر سے متعلق رہے، لیکن ان کی اس کے مالکوں سے نبھ نہ سکی۔ وہ کچھ نیم سرکاری قسم کے لوگ تھے، قدم پھونک پھونک کر رکھنے والے اور سرکار و ولتہ دار کی چشم و ابرو کے اشاروں کی رعایت کرنے والے۔ ادھر مولانا آزاد وکیل کے زمانہ ادارت میں ہندستان تو الگ رہا، دنیا جہان کی سیاست اور عالم اسلامی کے معاملات پر اسے زنی کرتے رہے تھے۔ وہ بھلا کس پابندی سے کیونکر خوش رہ سکتے تھے: غرض کہ یہ 'دار السلطنت' سے الگ ہو گئے۔ چونکہ امرتسر سے علیحدگی کسی اختلاف کی بنا پر نہیں ہوئی تھی، وہ تو خانگی حالات کی مجبوری کا نتیجہ تھی۔ اس لیے یہ اگلے ہی برس یعنی اگست / ستمبر ۱۹۰۶ء میں امرتسر چلے گئے۔ اب کے انہوں نے اخبار میں یہ

۷۹۔ ایضاً: ۱۸۱

۸۰۔ ایضاً: ۳۱۵

۸۱۔ ایضاً: ۳۲۳۔ یہاں وکیل سے دونوں تعلقات کے درمیان آٹھ مہینے کا فاصلہ لکھا ہے۔

تبدیلی کی کہ اسے ہفتہ میں تین مرتبہ چھاپنے کی بجائے سہ روزہ کر دیا یعنی ہفتہ میں دو بار۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں مولانا عبداللہ عمادی بھی ان کے ساتھ وکیل میں کام کرتے رہے۔ مولانا عمادی بڑے فاضل اور خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ کبھی کبھی 'خدا بندہ' کے قلمی نام سے بھی لکھا کرتے تھے، جو عبداللہ کا ترجمہ ہے۔ مولانا آزاد اور مولانا عمادی کی خوب گاڑھی چھنی۔ یہ انھیں ابتدائی تعلقات کا نتیجہ تھا کہ بعد کو مولانا آزاد نے جب کلکتہ سے اہلال جاری کیا تو مولانا عمادی بھی اس کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔ ان کا سوال ۱۳۶۶ھ (۱۲ اگست ۱۹۴۷ء) کو حیدرآباد میں انتقال ہوا۔

وکیل سے یہ دوسری مرتبہ کا تعلق بھی نو دس مہینے سے زیادہ نہیں رہا۔ وہ وسط ۱۹۰۸ء کے بعد (تقریباً جولائی، اگست میں) وکیل سے مستعفی ہو گئے۔ امرتسر سے پہلے بھوپال گئے اور وہاں اپنی ہمشیر آبرو بیگم سے ملتے ہوئے بمبئی کے راستے پونا چلے گئے۔ پنجاب میں گرمی کا موسم بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس سال برسات بھی بہت کم ہوئی تھی۔ اس لیے یہ امرتسر کے قیام کے زمانے میں بیمار ہو گئے تھے، چنانچہ بحالی صحت کے لیے پونا کا موسم بہت اچھا رہا۔

یہیں پونا میں تھے کہ کلکتہ سے والد کی شدید علالت کا تار ملا۔ یہ والد کے پرانے خادم حافظ ولی اللہ بنارس کے ساتھ کلکتہ روانہ ہو گئے۔ ۱۵ اگست کی صبح کو وہاں پہنچے۔ اگرچہ یہ ان کا مرض الموت تھا، لیکن ہوش و حواس آخر تک قائم رہے۔ آتے جاتے کو پہچانتے تھے، خود مولانا آزاد سے وفات سے آدھ گھنٹہ پہلے تک باتیں کرتے اور مختلف قسم کی ہدایتیں اور وصیتیں کرتے رہے۔ حافظ ولی اللہ نے جب حالت غیر دیکھی، تو سورہ یسین کی تلاوت شروع کر دی۔ انھیں اشارے سے منع کر دیا اور خود سورہ یسین پڑھنے لگے۔ دس پندرہ منٹ بعد جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۸۴۔ آزاد کی کہانی: ۳۲۳-۳۲۵

۸۳۔ یاد رنگاں (سید سلیمان ندوی): ۳۹۶

۸۵۔ آزاد کی کہانی: ۱۳۶-۱۳۷

جب ان کی بیوی کا ۱۸۹۹ء میں انتقال ہوا ہے تو انھوں نے مانک تلہ کے قبرستان میں ان کی قبر پر ایک مختصر سا گنبد بنا مقبرہ بنوایا تھا، اور اسی کے پہلو میں اپنے لیے بھی جگہ چھوڑی تھی۔ وہیں دفن ہوئے ان کے مرید ہر سال ۱۴ رجب کو یہاں عرس کیا کرتے تھے، بوجہ ۱۹۶۰ء کے بعد یہ نہ ہو سکا۔

اب یہ گویا ہر طرح آزاد ہو گئے؛ غم دزدو نے غم کالا۔ انھوں نے باہر جانے کا پروگرام بنایا، چنانچہ عراق، لبنان، مصر کی سیر کرتے ہوئے فرانس تک پہنچے۔

کتابیات

- ۱۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی
 - ۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد (انگریزی)
 - ۳۔ اخبار الاخبار
 - ۴۔ انڈیا نوس فریم (انگریزی)
 - ۵۔ تذکرہ از ابوالکلام آزاد
 - ۶۔ حیات جاوید از الطاف حسین حالی
 - ۷۔ حیات شبلی از سید سلیمان ندوی
 - ۸۔ خطبات عالیہ (۱)
 - ۹۔ خم خانہ جاوید (۱) از لالہ سری رام
 - ۱۰۔ ذکر آزاد از عبد الرزاق طلیح آبادی
 - ۱۱۔ غالب از غلام رسول مہر
 - ۱۲۔ غبارِ خاطر از مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ مالک رام
 - ۱۳۔ غیر مطبوعہ تحریر اقلی از مولانا ابوالکلام آزاد
 - ۱۴۔ مرتبہ کانفرنس مرتبہ حاجی انوار احمد مارہروی
- (دہلی: اپریل ۱۹۵۸ء)
(بمبئی: ۱۹۵۹ء)
(دہلی: ۱۹۳۲ء)
(کلکتہ: ۱۹۵۹ء)
(طلیح آباد: دہلی: ۱۹۶۹ء)
(علی گڑھ: ۱۹۲۶ء)
(غٹھ گڑھ: ۱۹۳۲ء)
(علی گڑھ: ۱۹۲۸ء)
(لاہور: ۱۹۵۰ء)
(کلکتہ: ۱۹۵۰ء)
(لاہور: ۱۹۳۶ء)
(دہلی: ۱۹۶۰ء)
(علی گڑھ: ۱۹۳۵ء)

۵۰ کچھ ابوالکلام آتما د کے بارے میں

- ۱۵۔ منتخب التواریخ (۳) از عبدالقادر بدایونی (کلکتہ: ۱۸۶۹ء)
۱۶۔ مولانا آزاد (انگریزی) از مہادیو ڈیساں (راج ہنس پریس، دہلی)
۱۷۔ نقش آزاد مرتبہ غلام رسول مہر (لاہور: ۱۹۵۸ء)
۱۸۔ یادِ رفتگان از سید سلیمان ندوی (کراچی: ۱۹۵۵ء)

رسائل وغیرہ

- ۱۹۔ آجکل (ماہنامہ) دہلی، (ستمبر ۱۹۵۹ء؛ اپریل ۱۹۶۲ء)
۲۰۔ اردو، سہ ماہی کراچی اکتوبر ۱۹۶۶ء
۲۱۔ اردو ادب (آزاد نمبر) علی گڑھ ۱۹۵۹ء
۲۲۔ صبح (ماہنامہ) دہلی، مارچ ۱۹۶۷ء
۲۳۔ عالمگیر (ماہنامہ) لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۰۶ء
۲۴۔ لسان الصدق (ماہنامہ) کلکتہ، جون/جولائی ۱۹۰۴ء؛ اپریل/مئی ۱۹۰۵ء
۲۵۔ ہندستان ٹائمز (روزنامہ انگریزی) دہلی؛ ۱۳ اپریل ۱۹۶۶ء

مولانا آزاد بحیثیت صحافی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مادری زبان اردو نہیں، عربی تھی۔ اُن کی والدہ عرب تھیں، مدینہ منورہ کے مفتی محمد بن ظاہر کی بھانجی۔ اس لیے لامحالہ مولانا آزاد کی اُن سے بات چیت عربی میں ہوتی ہوگی۔ بچپن میں اُن کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی زبان سیکھنے کا امکان بھی نہ تھا کیونکہ خاندان حجاز میں تقیم تھا جہاں اردو کی تعلیم و تدریس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بعد کو جب تعلیم شروع ہوئی تو وہ بھی عربی اور فارسی تک محدود رہی! اور چونکہ اُن کا خاندان اپنے علم و فضل اور مذہبی تقدس کے باعث برگزیدہ رہا تھا، اس لیے جب تعلیم کا آغاز ہوا تو دینیات پر خصوصی توجہ رہی۔ انھوں نے پندرہ برس کی عمر میں وقت کا درسِ نظامی مکمل کر لیا تھا۔

لیکن وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں اس سے پہلے داخل ہو چکے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۹ء میں جب اُن کی عمر ہنوز ۱۱ برس سے متجاوز نہیں ہوئی تھی، شعر گوئی شروع کی۔ عام حالات میں گیارہ برس کا بچہ کوئی علمی بات تو درکنار، اپنے خیالات اور مافی الضمیر کو بھی مسلسل اور قابلِ لحاظ پیرایے میں بیان کرنے پر قدرت نہیں رکھتا، چہ جائے کہ شاعری۔ مولانا آزاد نے اس عمر میں باقاعدہ شاعری شروع کر دی تو اب دستورِ زمانہ

کے مطابق استاد کی ضرورت پیش آئی۔ اس دور میں امیر مینالی اور داغ دہلوی کا ملک بھر میں طوطی بولتا تھا۔ بلا مبالغہ سیکڑوں شاگرد ان کے دامن تربیت سے وابستہ تھے۔ قدرتاً مولانا آزاد کی نگاہ بھی انھیں پر پڑی۔ پہلے انھوں نے داغ سے تعلق قائم کیا۔ ممکن ہے اس فیصلے میں ان کی دہلویت بھی کسی حد تک اثر انداز رہی ہو، کیوں کہ مولانا آزاد کا اپنا خاندان بھی دہلوی تھا، اگرچہ وہ خود مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کے والد مولانا خیر الدین پشتینی دہلوی تھے، مشہور کوچہ پنڈت کے رہنے والے۔ وہیں ان کا اپنا مکان تھا۔ غرض انھوں نے شروع میں داغ سے سلسلہ تلمذ قائم کیا، لیکن معلوم نہیں کیوں، یہ تعلق دو تین غزلوں سے آگے نہ بڑھ سکا اور وہ اسے منقطع کر کے امیر مینالی سے مشورہ کرنے لگے۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ دو چار غزلوں کے بعد دل اچاٹ ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ محض زبان اور اصلاح کا نہیں، بلکہ نظریہ اور مقصد شاعری کا تھا۔ داغ اور امیر دونوں کی شاعری میں زبان پر زیادہ توجہ رہی۔ گہرائی اس میں بہت کم بلکہ برائے نام ہے۔ داغ کی بہ نسبت امیر میں صلاحیت کہیں زیادہ تھی۔ اور ان کی خاندانی روایت اور پس منظر بھی داغ سے بہتر تھا۔ لیکن داغ کی شہرت اور مقبولیت اور ہر دلعزیزی نے انھیں بہکایا اور وہ بھی اسی سطح پر باتیں کرنے لگے، جو داغ کا طرہ امتیاز تھیں۔ نتیجہ معلوم! خیر یہ دوسرا موضوع ہے، اس کے بارے میں پھر کبھی۔ امیر کے بعد مولانا آزاد نے چندے مولانا محمد ظہیر احسن شوق نیومی سے اصلاح لی۔ یہ تعلق نسبتاً طویل ثابت ہوا۔ لیکن نتیجے کے لحاظ سے اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیوں کہ جلد ہی مولانا آزاد نے سرے سے شاعری ترک کر کے اپنی پوری توجہ نثر نگاری پر مرکوز کر دی۔ ان کا سارا شعری سرمایہ جو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے، ڈھائی تین سو شعر سے زیادہ نہیں۔

غرض جیسا کہ کہا گیا مولانا آزاد نے دس گیارہ برس کی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی، لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، بعض اور اصحاب بھی اتنی کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ مولانا آزاد کی فضیلت کی بات یہ ہے کہ انھیں اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ شاعری

کے ساتھ ایک گلدستہ بھی شائع کرنا چاہیے۔ تاکہ ہر مہینے "طرح" پر ملک کے مختلف شعرا سے غزلیں منگوا کر اس میں شائع کی جائیں۔ اس سے جہاں ایک مشغلہ ہاتھ آجائے گا وہیں مقابلے میں غزلیں کہنے سے مشق اور مزاولت میں بھی مدد ملیگی اور کلام میں ترقی کا موقع بھی ملیگا۔ ایک گیارہ برس کے لڑکے کا اس انداز سے سوچنا واقعی حیرت انگیز ہے۔ غرض انھوں نے غالباً نومبر ۱۸۹۹ء میں "نیرنگ عالم" کے نام سے ایک ماہانہ گلدستہ کلکتہ سے جاری کیا۔ میری نظر سے اس کا کوئی شمارہ نہیں گزرا، اگرچہ اس کے ایک شمارے کی موجودگی میرے علم میں ہے۔ اس پرچہ میں صرف شعری کلام چھپتا تھا۔ نثر بالکل نہیں تھی۔

"نیرنگ عالم" پورا ایک برس بھی نہیں چلا، اس سے پہلے ہی بند ہو گیا۔ غالباً اس کے صرف آٹھ شمارے شائع ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے کلکتہ ہی سے ایک اور ماہانہ "المصباح" نام کا جاری کیا۔ یہ بھی زیادہ دن نہ چلا۔ اس کے کسی پرچے کی موجودگی میرے علم میں نہیں ہے۔

"نیرنگ عالم" اور "المصباح" دونوں مشق کی ذیل میں آتے ہیں۔ آپ نے بڑے بڑے خطاطوں اور خوشنویسوں کی مشق کے نمونے ملاحظہ کیے ہونگے۔ جب کوئی خوشنویس وصلی لکھنے کا عزم کرتا ہے، تو اس سے پہلے حروف اور دائرے کسی ترتیب اور نظام کے بغیر کاغذ پر بناتا رہتا ہے۔ بعض ایسی مشقیں جو روزِ زمانہ کے باوجود محفوظ رہ گئی ہیں، ان کی عجیب شان ہے۔ حرف پر حرف اور دائرے پر دائرہ لکھا اور بنا ہوا ہے۔ استاد کا مقصد اس سے یہ ہوتا تھا کہ ہاتھ ذرا بیٹھ جائے تاکہ اصلی وصلی لکھتے وقت ہاتھ میں اغزش نہ ہو۔ یہ دونوں پرچے بھی ایک طرح سے مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کے یہ گویا مشق کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۰۵ء میں کلکتہ سے ایک ماہنامہ "لسان الصدق" کے نام سے جاری کیا۔ یہ پہلے دونوں پرچوں سے الگ نوعیت کا تھا۔ "نیرنگ عالم" تو صرف شعری گلدستہ تھا جس میں کوئی نثری حصہ نہ تھا ہی نہیں۔ "المصباح" کا کوئی شمارہ نظر سے نہیں گزرا، اس لیے اس کے بارے میں یقین

سے کچھ کہنا محال ہے، لیکن اس کے نام سے شبہ گزرتا ہے کہ شاید یہ پرچہ مذہبی نوعیت کا ہو۔ اب "لسان الصدق" جو جاری ہوا تو اس میں نظم بالکل نہیں تھی، اس کا پورا فائل میری نظر سے گزرا ہے۔

"لسان الصدق" کا پہلا شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا۔ اس کے پہلے شمارے میں اس کے جو مقاصد چھپے ہیں، وہ یہ تھے:

- ۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔
- ۲۔ ترقی اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔
- ۳۔ علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگلہ میں۔

۴۔ تنقید یعنی اردو تصنیفات پر منصفانہ ریویو۔

جب یہ ماہنامہ جاری ہوا ہے تو مدیر محترم کی عمر پندرہ برس سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ یہ عمر اور پرچے کے یہ بھاری بھر کم سنجیدہ مقاصد۔ پھر یہ محض دعویٰ ہی نہیں رہے۔ انھوں نے واقعی "لسان الصدق" کو اسم با مستمی بنا دیا۔ اس کے مضامین کا معیار اتنا معتبر اور بلند تھا اور تحریر کا انداز ایسا دلکش کہ اس نے فوراً صف اول کے پرچوں میں جگہ حاصل کر لی۔ ستارہ درخشید و ماہ کامل شد۔ اس پر اس دور کے بعض پُرانے اور مشہور جرائد میں بہت اچھے تبصرے شائع ہوئے۔ اس کے مضامین میں لہجے کی متانت اور اسلوب کی ثقاہت سے بیشتر پڑھنے والوں کو خیال ہوا کہ مدیر کوئی معزز و مخورہ اور تجربہ کار بزرگ ہیں۔ اس رسالے نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ انجمن حمایت اسلام، لاہور اس دور کا مشہور ادارہ تھا؛ آج بھی ہے۔ اس کے سالانہ اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتے تھے۔ انجمن کے ارباب حل و عقد باہر کے اصحاب علم حضرات کو خاص دعوت دے کر اس میں تقریر کرنے کو بلاتے تھے۔ "لسان الصدق" کے مضامین کے معیار اور خطیبانہ انداز نے انجمن حمایت اسلام کے اصحاب مجاز کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے اپنے ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے کے لیے انھیں لاہور آنے اور اجلاس کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ یقیناً انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ حضرت مدیر کوئی عمر رسیدہ عالم دین بزرگ ہیں۔

تصور کیا جاسکتا ہے کہ جب ابوالکلام آزاد کی شکل میں ایک ۱۵-۱۶ سال کا بے ریش و برکت لڑکا اُن کے سامنے پیش ہوا تو اُن پر کیا گزری ہوگی۔ بارے، اگلے دن مولانا آزاد کی تقریر سے اُنھیں مایوسی نہیں ہوئی کیوں کہ اُس سے اگلے دن اُن سے پھر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اُن کا تقریر کا موضوع تھا "تبلیغ اسلام کا طریق کار"۔ یہ اجلاس یکم اپریل ۱۹۰۴ء تک ہوئے تھے۔

اسی موقع پر مولانا آزاد کی پہلی ملاقات مولانا حسانی سے ہوئی۔ اس کا قصہ بھی بڑا پُر لطف ہے۔

مولانا آزاد انجمن کے اجلاس شروع ہونے سے ایک دن پہلے لاہور پہنچ گئے تھے۔ اسی دن ان کی ملاقات مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی سے ہوئی۔ سلیم کو جب معلوم ہوا کہ یہی "لسان الصدق" کے مدیر شہیر ہیں تو اُنھوں نے بجا طور پر اُسے عجائب عالم میں سے خیال کیا۔ وہ اُنھیں مولانا حالی کے پاس لے گئے، جو جلسے میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے اور دوسری جگہ کسی دوست کے ہاں مقیم تھے۔ جب سلیم، مولانا آزاد کو ساتھ لیے پہنچے، تو تعارف سے پہلے اُنھوں نے حالی سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ان کی عمر کیا ہوگی؟ حالی کی طبیعت کا حزم و احتیاط معلوم ہی ہے۔ اُنھوں نے تامل سے جواب دیا بھی بہت کم سن ہیں۔ اس پر سلیم نے اصرار کیا کہ نہیں، فرمائیے، آپ کے خیال میں کیا عمر ہوگی؟ بالآخر مولانا حالی نے کہا "یہی پندرہ سولہ سال کی ہوگی"۔ اب سلیم نے اُنھیں بتایا یہی "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ پرچہ مولانا حالی کی نظر سے بھی گزرتا تھا۔ اور وہ اس کے مضامین کے مددات تھے۔ ساری دنیا کی طرح وہ بھی یہی گمان کرتے تھے کہ رسالے کے ایڈیٹر کوئی تجربہ کار عالم صحافی ہونگے۔ یہ معلوم کرنے اُنھیں بہت تعجب ہو گیا۔

نوعمر ما جزا دے اس ماہنامے کے ایڈیٹر ہیں۔ اُس دن جو تعلقات دونوں مینٹلم ہونے امتدادِ زمانہ سے اُن میں استواری آئی اور ایک دوسرے سے متعلق عزت اور محبت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔

انسوس کہ "لسان الصدق" نے بھی کوئی اچھا رہ مہینے میں دم توڑ دیا۔ مولانا آزاد کی سیما بی

فطرت انہیں کوئی کام جم کر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اس پر ان کا اکثر سفر میں رہنا! لازماً اس کا پرچہ کی باقاعدہ اشاعت پر پڑا۔ بعض اوقات دو دو مہینوں کے لیے صرف ایک شمارہ شائع ہوا۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوگا کہ نومبر ۱۹۰۳ء کے بعد دسمبر کا پرچہ شائع ہوا تو اس پر پہلی جلد کی تکمیل کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۹۰۴ء کے پورے سال میں صرف نو شمارے شائع ہوئے؛ اور اس سال کا آخری پرچہ بھی اگست اور ستمبر (۱۹۰۴ء) کا مشترکہ شمارہ تھا؛ اسی پر دوسری جلد ختم ہو گئی، ۱۹۰۴ء میں اور کوئی پرچہ نہیں نکلا۔ ۱۹۰۵ء میں صرف ایک پرچہ شائع ہوا۔ جو اپریل اور مئی کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اس کے بعد "لسان الصدق" بند ہو گیا۔

۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی نے انہیں دعوت دی کہ وہ لکھنؤ آئیں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماہانہ رسالے "الندوۃ" کی ترتیب و تدوین میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ "الندوۃ" کا فائل آج بھی ملتا ہے۔ یہ خالص علمی و تحقیقاتی پرچہ تھا اور ندوۃ العلماء کا آرگن ہونے کی وجہ سے اس کی ایڈیٹری بڑی ذمے داری کا کام تھا۔ چنانچہ مولانا شبلی خود اس کے ایڈیٹر تھے۔ اور وہی مجلس ندوۃ العلماء کے سامنے اس کے لیے جوابدہ بھی تھے۔ مولانا شبلی جس پائے کے مصنف اور نقاد ہیں، اس کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ اسے مد نظر رکھتے ہوئے ان کا سترہ سالہ نوجوان آزاد کو "الندوۃ" کی ادارت میں شرکت کی دعوت دینا حیرتناک تو ہے ہی، لیکن اس سے بڑھ کر یہ مولانا آزاد کے علم و فضل کی، ان کی تحریر کے نغیاب اور پختگی کی، ان کی ذاتی متانت اور رکھ رکھاؤ کی عادت بھی اتنی بڑی سند ہے کہ مشکل سے اس کی مثال کہیں اور ملیگی۔

مولانا آزاد اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک چھ مہینے "الندوۃ" سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کسی وجہ سے خود یہ تعلق قطع کر لیا۔

"لسان الصدق" کی ادارت کے زمانے میں مولانا آزاد کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی اور بہت لوگ ان کے مداح بن گئے تھے۔ انہیں میں ایک صاحب شیخ غلام محمد امرتسر کے رہنے والے تھے۔ وہ اس زمانے کے مشہور روزہ اخبار "دکیل" کے مالک تھے

جو امرتسر ہی سے شائع ہوتا تھا۔ جب مولانا آزاد "الندوہ" کے ادارہ تحریر سے الگ ہوئے تو شیخ غلام محمد نے انہیں امرتسر آنے اور "وکیل" کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ اس پر مولانا امرتسر چلے گئے۔ انہوں نے اپنے زمانہ ادارت میں "وکیل" میں بہت خوشگوار تبدیلیاں کیں، جس سے پرچے کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ لیکن ایک نئی حادثہ ایسا پیش آگیا کہ انہیں بادلِ ناخواتر جلد ہی امرتسر سے واپس جانا پڑا۔

مولانا آزاد کے ایک بڑے بھائی تھے، مولانا ابونصر غلام یسین آہ۔ دونوں بھائیوں کی تعلیم ایک ہی پنچ اور معیار پر ہوئی تھی۔ ان کے والد مولانا خیر الدین کا پیری مریدی کا سلسلہ بھی تھا۔ کلکتے اور بمبئی کے اطراف میں ان کے مریدوں کی خاصی تعداد تھی۔ وہ بڑے

بیٹے غلام یسین آہ کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ آہ بھی خوبو میں اپنے والد کے نقش قدم پر تھے، لیکن خدا کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ آہ تفریحاً عراق کے سفر پر گئے اور وہاں بیمار ہو گئے۔ حالت خراب سے خراب تر ہو گئی تو واپس بمبئی آئے، تاکہ یہاں مناسب علاج ہو سکے۔ حالت سدھرنے کی جگہ اور بگڑ گئی۔ والد کلکتے سے بمبئی پہنچے اور انہیں ساتھ لوالے گئے، لیکن ان کا وقت اخیر آ پہنچا تھا۔ کلکتے پہنچنے

کے بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ وسط ۱۹۰۶ء کی بات ہے جب مولانا آزاد امرتسر میں "وکیل" سے وابستہ تھے۔ مولانا خیر الدین نے انہیں لکھا کہ اب تم گھر آ جاؤ اور کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ یہ ابھی جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ نومبر ۱۹۰۶ء میں والد نے ایک آدمی امرتسر بھیج دیا کہ انہیں اپنے ساتھ کلکتے لے آئے۔ اب کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا۔ یہ کلکتے چلے گئے۔ امرتسر کا زمانہ قیام اپریل ۱۹۰۶ء سے نومبر ۱۹۰۶ء تک صرف آٹھ

ہفتے رہا۔ وہ والد کے حکم کی تعمیل میں مجبوراً کلکتے چلے تو گئے، لیکن سچ یہ ہے کہ وہاں جو کام ان کے سپرد کیا گیا، وہ کسی عنوان ان کی پسند کا نہیں تھا۔ مریدوں کی تعلیم و تربیت، پسند و وعظ وغیرہ سے وہ کوسوں دور تھے۔ ادھر اخبار نویس کا مشغلہ ان کا دل پسند کام تھا۔ شیخ غلام محمد بھی ان کے کام سے ہر طرح مطمئن اور خوش تھے۔ قصہ کوتاہ چند دن بعد انہوں نے والد سے کھل کر کہہ دیا کہ میں اس پیری مریدی کے کاروبار کو جاری نہیں رکھ سکتا، مجھے یہ

پسند ہے کہ لوگ آئیں اور میرے ہاتھ پاؤ کو فرطِ عقیدت سے بوسہ دیں۔ والد آدمی سمجھدار تھے۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں، ان کی مرضی کے خلاف انھیں کسی کام پر مجبور کرنے سے فائدہ! انھوں نے اجازت دے دی کہ اچھا اگر یوں ہے تو تم واپس امرتسر جا سکتے ہو۔ اس پر یہ اگست ۱۹۰۷ء میں امرتسر چلے گئے اور دوبارہ "وکیل" کی ادارت کی باگ ڈور ان کے سپرد کر دی گئی لیکن اب کے ان کی صحت جواب دے گئی! وہ بیمار رہنے لگے۔ سال بھر بھی مشکل سے وہاں رہے، اور جولائی/ اگست ۱۹۰۸ء میں "وکیل" سے الگ ہو گئے۔

اب ان کی عمر ۲۰ سال کے لگ بھگ تھی، اس دوران میں انھوں نے کئی پرچوں میں کام کیا۔ ان میں سے بعض ان کی ذاتی ملکیت تھے، بعض دوسروں کے، جہاں وہ تنخواہ پر ملازم کی حیثیت سے کام کرتے رہے، لیکن وہ کہیں بھی رہے ہوں، ان کا نصب العین ہمیشہ بلند رہا۔ ان کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ صحافت کو ملک و ملت کی بہتری اور بہبودی، خدمت گزار اور خیر خواہی کا وسیلہ بنایا جائے۔ یہ اخبار اور رسالے گویا ان کی تجربہ گاہ تھے، جہاں وہ اس تلاش میں رہے کہ ان کے اخبار کا سطح نظر کیا ہونا چاہیے۔ اور آخر کار انھیں معلوم ہوا تو یہ کہ جس منزل مقصود کی تلاش میں وہ اتنے دن سے بھٹک رہے ہیں، وہ کہیں باہر نہیں، بلکہ خود ان کے پاس تھی۔ ان کے نصب العین کو ان کے جاری کردہ ہفتہ وار "الہلال" نے پورا کیا۔

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا

اور سب باتوں کو چھوڑ کر "الہلال" کے صرف ادارہ تحریر ہی کو لیجیے، تو حیرت ہوتی ہے۔ مولانا آزاد کے علاوہ اس میں مختلف اوقات میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد اللہ عادی، مولانا عبدالسلام ندوی اور بعض دوسرے اصحاب کام کرتے رہے اور سب کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ ہفتہ وار تو درکنار، کیا آج تک کسی اردو ماہنامے کو بھی اتنا وسیع اور شاندار ادارہ تحریر نصیب ہوا ہے۔ پھر ان مستقل معاونین کے علاوہ جو اسٹاف میں کام کرتے تھے، اس کے مضمون نگاروں میں ملک میں صفِ اول کے ادیب اور انشاپرداز

تھے۔ مولانا شبلی کی بعض معرکے کی نظمیں پہلی مرتبہ "الہلال" ہی میں شائع ہوئیں۔ غرض "الہلال" صحیح معنوں میں ہماری سیاسی اور صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوا۔

اس کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا تھا۔ جیسا کہ انہوں نے شروع سے بار بار اعلان کیا "الہلال" ایک "دعوت" تھا، جس کا مقصد دین الہی اسلام کی تجدید اور اس کے بنیادی اصول "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو زندہ کرنا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی کوئی قابل اعتراض بات دیکھتے، بیابکانہ اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر دیتے۔ اس میں حکومت اور عمال حکومت پر خاص طور سخت لب و لہجہ میں نکتہ چینی ہونے لگی۔ حکومت بھلا اسے کیوں برداشت کرنے لگی تھی۔ "الہلال" کو جاری ہونے مشکل سے سال بھر ہوا ہوگا کہ حکومت نے ۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو اس سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی، جو فوراً ادا کر دی گئی۔

۴ اگست ۱۹۱۲ء کو پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے یہاں کے لوگوں سے استبواب رائے کیے بغیر ہندستان کی طرف سے بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ مولانا آزاد ہر بننے حکومت کی بدعنوانیوں پر تو پہلے ہی سے لکھتے آرہے تھے، اب انھیں جنگ کی وجہ سے اور وسیع میدان ہاتھ آ گیا۔ یورپ میں جنگ کا پلڑا بھی اس وقت تک جرمنی کے حق میں تھا۔ "الہلال" کے مضامین نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ اس کے ۱۳ اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۳ء کے دو شمارے ۱۶-۱۷ مشترک شائع ہوئے تھے۔ اس میں دو مضمون تھے: "حدیث الجنود" اور "مقطوعہ انورپ"۔ بیلیجیم کے فوجیوں کی ایک تصویر جس کے نیچے یہ عبارت تھیں:

بلجین سپاہ کا ایک گروہ جنگ سے پہلے آرام کر رہا ہے۔ یہ راحت

کی آخری گھڑیاں تھیں، جو اس بد بخت قوم کو نصیب ہوئیں۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ

۱ اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود ہی اپنے آپ

پر ظلم کر رہے ہیں، (۱۶: ۳۲)

حکومت آج تک "الہلال" کے خلاف سخت اقدام سے اس لیے گریز کرتی رہی تھی کہ یہ ایک نیم مذہبی جریدہ ہے، لیکن وہ موقع کی تلاش میں تھی۔ جب "الہلال" میں مندرجہ صدر مضمون شائع ہوئے تو حکومت کے نفس ناطقہ روزنامہ "پانیر" نے آباد نے اس کے خلاف ایک بہت سخت مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا:

PRO-GERMANISM IN CALCUTTA

اس میں منجملہ اور باتوں کے اخیر میں لکھا تھا کہ جو حکومت:
 برطانوی فوج اور بحریہ کے خلاف ایسے نفرت انگیز اور کینہ پرور
 الزامات کی کھل چھٹی دیتی ہے، وہ سخت غیر جرمن رواداری کا
 منشا ہرہ کر رہی ہے۔

اس کے بعد حکومت بنگال نے "الہلال" کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کر لی؛ مشترکہ شمارہ بھی
 ضبط کر لیا؛ اور مزید دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ یہ ان کی استطاعت سے کہیں زیادہ
 مطالبہ تھا؛ انہوں نے پڑھ بند کر دیا۔ اس کے آخری پڑھ پر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کی تاریخ ثبت
 ہے اور شمارہ نمبر ۲۰۔

کوئی سال بھر کے التوا کے بعد انہوں نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو دوسرا پڑھ "البلاغ" جاری کر دیا۔
 صرف نام کا فرق تھا اور نہ دونوں کی صورتی اور معنوی حیثیت میں قطعاً کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن
 "البلاغ" نے بہت کم عمر پائی یہی تقریباً پانچ مہینے۔ اوائل مارچ ۱۹۱۶ء میں حکومت بنگال
 نے ڈیفینس آف انڈیا آرڈیننس (قانون) کے تحت ان کے صوبے سے اخراج کا حکم جاری
 کر دیا۔ اسی کے ساتھ "البلاغ" بند ہو گیا۔ بیشتر صوبوں کی حکومتیں اپنے ہاں ان کا داخلہ
 پہلے سے ممنوع قرار دے چکی تھیں؛ صرف بہار اور بمبئی ہی ایسے دو صوبے تھے، جہاں وہ
 جاسکتے تھے۔ بہار میں یہ سہولت تھی کہ کلکتے سے قریب تھا، لوگوں کو وہاں آنے جانے میں
 کم وقت اور خرچ پر ملاقات کا موقع مل سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے قیام کے لیے

۱۔ عام خیال ہے کہ پانیر نے یہ مضمون یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر کے ایما پر شائع کیا تھا۔

رائچی کا انتخاب کیا۔ ابھی اس حکم پر اور ان کے رائچی میں قیام پر پانچ مہینے بھی نہیں گزریے تھے کہ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت ہند نے ان کی رائچی ہی میں نظر بندی کا حکم جاری کر دیا۔ وہ چار سال بعد ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے۔

”الہلال“ کسی لحاظ سے عہد آفریں ثابت ہوا۔ اس شان کا کون ہفتہ وار پرچہ اردو میں شائع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد بھی جو پرچے نکلے، ان کے سامنے نمونہ ”الہلال“ ہی کارہا۔ ہر ایک کی یہی خواہش رہی کہ شکل و صورت، مضامین کی ترتیب، ادارے، تصاویر وغیرہ میں ”الہلال“ کا متبع کریں۔

لیکن ظاہری حسن اور طباعتی خوبیوں سے قطع نظر ”الہلال“ کا اصلی کارنامہ اس کے مدیر شہیر کی طرز تحریر کی بداہت تھی۔ کاہے کو کبھی کسی رسالے کے ایڈیٹر نے اپنے ہم وطنوں کو، ارباب حکومت کو، اکابر قوم کو، علمائے دین کو یوں للکارا ہوگا۔ مولانا آزاد نے کسی کو نہیں بخشا؛ اور کوئی ان کی نگاہ احتساب کی زد سے باہر نہیں رہا۔ جہاں بھی کوئی غلط بات ان کے سامنے آئی، انھوں نے اس پر بخونی اور عواقب سے بے پروا ہو کر گرفت کی اور سب سے بڑی بات یہ کہ خوش نصیبی سے ان کی بے لاگ تنقید کا اثر ہوا، اور اس سے حسبِ دلخواہ نتائج پیدا ہوئے۔

بدیشی حکومت پر ان کی گرفت اور بھی شدید تھی اور جب یہ خیال میں رہے کہ ”الہلال“ جولائی ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا اور ”البلاغ“ سمیت اپریل ۱۹۱۶ء میں بند ہو گیا۔ یعنی لے دے کے ساڑھے تین برس، تو اس کے اثرات اور نتائج سے حیرت ہوتی ہے۔ اس وقت تک ہماری قومی تحریک اس مرحلے پر تھی کہ دو سردوں کا تو کیا ذکر کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بھی سب سے پہلی قرارداد حضور قیصر ہند ملک معظم سے ملک و قوم کی وفاداری کی منظور کی جاتی تھی۔ مہاتما گاندھی ہنوز جنوبی افریقہ سے ہندستان نہیں پہنچے تھے۔ اور پوری سیاسی تحریک بہت ہی نرم زو اور نرم گفتار تھی۔ حکومت پر اس کے اعمال و اقوال پر کڑی نکتہ چینی کی ابتدا ”الہلال“ ہی سے ہوئی۔

صحافت کو بوجہ ادب میں شمس نہیں کیا جاتا، لیکن ”الہلال“ کے کسی مضمون ادب میں بھی بلند

مقام پانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے جو مقالے مسلم یونیورسٹی سے متعلق لکھے تھے، اور جن میں طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہے، وہ ادبی لحاظ سے بھی بہت قیمتی اور اہم ہیں۔ "الہلال" کی ادبی خدمات اپنی جگہ، لیکن اس رسالے کا جو اثر اپنے زمانے کے اور بعد کے لکھنے والوں نے قبول کیا، وہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ ہمارے بعض مشہور ادیب "الہلال" اور مولانا آزاد کے اسلوب تحریر کے متبع اور خوشہ چین تھے۔ اس سلسلے میں نیاز فتح پوری اور غلام رسول قہر کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ "الہلال" میں ان کی شعلہ نوائی اور اس کی پاداش میں ان کی چار سالہ نظر بندی نے انہیں ملک کے تمام حلقوں کا منظور نظر بنا دیا تھا۔ جب جنوری ۱۹۲۰ء میں وہ رانچی سے رہا ہو کر واپس آئے تو ہر کوئی ان کے استقبال کے لیے بیقرار اور حشمت برادہ تھا۔ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ اہل وطن کے اس کلی اعتماد اور اشتیاق اور عقیدت کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو ملک کی سیاست کے لیے وقف کر دیا۔

یہ زمانہ انتہائی مصروفیت کا رہا۔ کانگریس اور خلافت تحریک نے ملک کے طول و عرض میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ مجلسِ خلافت کا ایک شاخسانہ جمعیتہ العلماء ہند کی شکل میں وجود میں آچکا تھا۔ مولانا آزاد ان سب تنظیموں کے بید سرگرم اور فعال کارکن تھے، وہ ان کی مجلس عاملہ کے رکن تھے اور بعض کے صدر بھی۔ لہذا ان کے لیے سکون سے کسی ایک جگہ قیام کرنا محال ہو گیا۔ صبح کہیں، شام کہیں۔ درمیان میں اگر کچھ وقت فرصت کا مل گیا تو وہ رفقائے کار اور ہم خیال احباب سے صلاح مشورے کی نذر ہو جاتا۔

لیکن وہ یہ کبھی نہیں بھولے کہ جب تک ایک اچھا اخبار پاس نہ ہو، اپنا مافی الضمیر عوام تک پہنچانا ممکن نہیں ہے۔ بالآخر انہوں نے ایک اور ہفتہ وار کی اشاعت کا انتظام کیا۔ اس کا نام "پیغام" تھا۔ اس کا پہلا پرچہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کلکتہ سے شائع ہوا۔ اگرچہ اس کی نگرانی تو انہوں نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی، لیکن ترتیب و تدوین کا سارا کام مولانا عبدالرزاق طبع آبادی کے سپرد کر دیا۔

اگرچہ "پیغام" میں مولانا آزاد کے بعض بڑے معرکے کے مضامین شائع ہوئے، لیکن یہ واقع

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

ہے کہ ملکی اور سیاسی ذمہ داریوں نے انہیں اتنی اجازت اور فرصت نہ دی کہ وہ اس میں کچھ زیادہ لکھ سکتے۔

اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ شہزادہ ویز کی ہندستان میں آمد اور اس کا ملک گیر بائیکاٹ ہے۔ وہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء کو یہاں پہنچے تھے۔ ”پیغام“ نے بھی اپنی بساط بھر اس بائیکاٹ کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا۔ حکومت بھلا اسے کیوں مکر معاف کر سکتی تھی۔ پہلے عبدالرزاق ملیح آبادی بحیثیت ایڈیٹر گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور انہیں دو سال کی سزا ہو گئی۔ ان کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو خود مولانا آزاد گرفتار ہوئے، اور انہیں ایک سال کی قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ ان کے مقدمے کی آخری پیشی ۹ فروری ۱۹۲۲ء کو ہوئی تھی۔ اسی دن انہوں نے اپنا وہ مشہور بیان عدالت کے سامنے پڑھا تھا، جو بعد کو ”قول فیصل“ کے عنوان سے شائع ہوا۔

ملیح آبادی اور مولانا آزاد دونوں کے جیل چلے جانے سے ”پیغام“ بند ہو گیا۔ اس کے آخری شمارے پر ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کی تاریخ ثبت ہے۔ گویا لے دے کے اس کی ساری تین مہینے کی عمر ہوئی۔ اس کے گل تیرہ شمارے شائع ہوئے تھے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ تجربہ بھی بہت کامیاب رہا۔ اس کی اشاعت دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ اس کی قیمت صرف دو آنے فی شمارہ تھی۔ لیکن بعض اوقات یہ ایک ایک روپے میں بکا اور ناشر پبک کا مطالبہ پورا کرنے سے قاصر رہے :

خوش درخشید و لے دولت مستعمل بود

یہ صحیح ہے کہ مولانا آزاد ایک مذہبی اور صوفی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی تعلیم، تربیت بھی اسی نہج پر ہوئی تھی۔ لامحالہ عمر بھر مذہب ہی ان کے غور و فکر کا محور رہا۔ انہوں نے جو تحریری ورثہ اپنے پیچھے چھوڑا، وہ بھی بیشتر مذہب اور مذہبی موضوعات ہی سے متعلق ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عملی زندگی اور معنوی اقتدار طبع کے لحاظ سے وہ بنیادی طور پر صحافی اور انشا پرداز تھے۔ انہوں نے انیسویں صدی میں آنکھیں کھولی تھیں، اور نشر و تبلیغ کے ذرائع اور وسائل کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ پریس اور اخبار کا مقام تہذیب جدید میں کتنا اہم ہے؛ اور اس کی قوت کتنی

اور کیسی دُور رس ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ ساری عمر کسی نہ کسی حیثیت سے رسائل و جرائد سے وابستہ رہے۔ اور جب بھی انھیں موقع ملا، انھوں نے اپنا ذاتی پرچہ جاری کرنے سے گریز نہیں کیا۔

”پیغام“ کے بند ہو جانے کے بعد سیاسی سرگرمیوں نے انھیں کسی اور موضوع کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں دی، لیکن وہ صحافت سے بیخبر نہیں رہے۔ کچھ دن تک تو وہ ایک روزنامہ جاری کرنے کے منصوبے پر بھی غور کرتے رہے۔ لیکن اس کے لیے جتنے سرمایے اور اہتمام اور لاؤشکر کی ضرورت ہے، اس کا انتظام آسان نہیں تھا۔ آخر کار انھوں نے روزنامہ کا خیال چھوڑ دیا اور ”الہلال“ ہی کو دوبارہ زندہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس سے یہ فائدہ بھی تھا کہ لوگ اس نام سے مانوس تھے اور دنیاے صحافت میں اس کی ساکھ بھی بہت بلند تھی۔

چنانچہ ”الہلال“ ثانی کا پہلا شمارہ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو دلی سے شائع ہوا۔ اس کی ترتیب و تدوین کی نگہداشت بھی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے سپرد رہی۔ مولانا آزاد کی اپنی مصروفیتیں ایسی تھیں کہ وہ اس دور میں اس کے لیے بہت کم لکھ سکے۔ قارئین جو ان کی تحریروں کے لیے بیصبری سے چشمِ براہ تھے، اس سے بہت مایوس ہوئے۔ لیکن مولانا آزاد بھی مجبور تھے، انھوں نے اتنے کام اپنے ذمے لے رکھے تھے اور ہر روز ملک کے طول و عرض سے اتنے مطالبے ان کے پاس پہنچتے تھے کہ وہ انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے میں وہ لکھنے کے لیے کیوں کرنال سکتے تھے!

”الہلال“ ثانی چھ ہیے جنی ۱۰ جون ۱۹۲۷ء سے ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔ اس دور میں اس کے صرف ۲۰ شمارے شائع ہو سکے۔ غالباً یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا مناسب ہو۔

”الہلال“ کے دورِ ثانی میں ایک مسلسل مضمون ”انسانیت موت کے دروازے پر“ شائع ہوتا رہا تھا۔ حسبِ معمول اس پر بھی مضمون نگار کا نام نہیں تھا۔ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ یہ مضمون مولانا آزاد کا ہے۔ چنانچہ بعد کو کسی ناشر نے اُسے ان کے نام سے کتابی صورت

میں شائع بھی کر دیا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ مضمون مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تصنیف ہے، اور اس کا مولانا آزاد سے انتساب غلط ہے۔ یہ بات مجھے خود ملیح آبادی مرحوم نے بتائی تھی۔ مولانا آزاد کی تعلیم سراسر عربی اور فارسی زبانوں کے ذخیرے تک محدود رہی تھی، اس کے بعد ان کا مطالعہ بھی انھیں علوم تک محدود رہا۔ تقریر اور خطابت کا شوق انھیں بچپن سے تھا جیسا کہ ان کی بڑی ہمشیرہ فاطمہ بیگم المتخلص بہ آرزو کی شہادت سے ظاہر ہے، فرماتی ہیں:

بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا شوق نہیں تھا، جو اکثر بچے کھیلا کرتے ہیں۔ ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں بھی عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی وہ گھر کے تمام صندوقوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے اور ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ چلا چلا کر کہو: ہٹو، ہٹو، راستہ دو، دن کے مولانا آ رہے ہیں۔ ہم لوگ اس پر کہتے تھے کہ بھائی، یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے۔ ہم کس کو دھکتا دیں اور کہیں کہ راستہ دو۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے۔ تم سمجھو کہ بہت لوگ مجھ کو لینے اسٹیشن پر آئے ہیں۔

پھر بھائی صندوقوں پر سے اترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے جیسے کہ بڑی عمر کے لوگ چلتے ہیں۔ کبھی وہ گھر میں کسی اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے تھے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم تالیاں بجاؤ اور تمہیں کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ میں کہتی کہ بھائی، سوا سوا ہم دو چار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے، ہم کیسے سمجھیں کہ یہاں ہزاروں آدمی کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے، کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

خطابت کا یہ شوق عمر کے ساتھ اور بڑھا۔ بلکہ اب یہ شوق ان کی تحریر میں بھی در آیا۔ لیکن تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس کے باوجود کہ ان کی تحریر عربی فارسی کے ثقیل الفاظ اور ترکیب سے گراںبار تھی، نہ اس کی روانی میں کمی آئی نہ اس کی شگفتگی اور دلکشی میں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے فقرے ایسے ترشے ترشائے ہوتے تھے جیسے کسی نے ہیرے کو کاٹ چھانٹ کر اُسے اور بھی حسین بنا دیا ہو۔

کئی لوگوں نے ان کی تحریر کی ثقالت اور عربی فارسی کے مشکل الفاظ کی کثرت پر اعتراض کیا ہے۔ یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے اور اُسے تسلیم کرنا پڑیگا۔ لیکن اس کی توجیہ بڑی آسان ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ "الہلال" میں ان کے مخاطب اہل علم بلکہ طبقہ علماء کے لوگ تھے۔ بیشتر موضوعات بھی انھیں اصحاب کی دلچسپی کے تھے۔ ایک طرف ان کی اپنی تعلیم کا پس منظر پیش نظر رکھیے، اور دوسری طرف ان کے مخاطبوں کا علم و فضل کا معیار، تو آپ لازماً اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان مقالات میں انھوں نے جو زبان اور لہجہ اختیار کیا وہی درست تھا۔ وہ اس سے آسان زبان لکھنے پر قادر تھے۔ ترجمان القرآن میں (تفسیر سورہ بقرہ) کے بعض حصوں کو چھوڑ کر، ان کی تحریر بہت سلیس اور آسان ہے، خاص کر اس کا ترجمہ اور حواشی والا حصہ۔ چونکہ انھیں معلوم تھا کہ ان کے بیشتر پڑھنے والے عوام اور تھوڑی استعداد کے لوگ ہونگے۔ اس لیے انھوں نے تکلموا الناس علی قدر عقولہم کے مصداق یہاں اسی سٹیج پر بات کی، جو فارسی کے علم و فہم کے مطابق تھی۔ ترجمان القرآن کی بات آگئی۔

اگرچہ ان کی تعلیم اپنی خانمانی روایات کے مطابق دینی علوم سے متعلق ہوئی تھی، لیکن وہ اسی پر عمل نہیں ہو گئے۔ انھوں نے وسیع اور گونا گوں مطالعے سے اس پر اضافہ کیا اور دوسروں کی تعلیم ہی پر قناعت نہیں کر لی، بلکہ اپنے غور و فکر سے اپنی راہ آپ نکالی۔ حافظ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھا اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ ہو گیا۔ شروع سے قرآن ان کے مطالعے اور غور و خوض کا محور و مرکز رہا تھا۔ "الہلال" میں انھوں نے قرآن کو ایسے انوکھے اور دلنشین انداز میں پیش کیا کہ اسے بالاسے طاق سے اتار کر روزمرہ کے استعمال

کی چیز بنا دیا۔

اپنے طویل تفکر اور تدبیر کے نتائج انھوں نے اپنی شہرہ آفاق تالیف ”ترجمان القرآن“ میں محفوظ کیے ہیں۔ افسوس کہ یہ تفسیر مکمل نہ ہو سکی! وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کر سکے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں نے ان کے اوقات اور صلاحیتوں پر غاصبانہ قبضہ جما لیا۔ اور وہ باقی حصے کی تفسیر قلمبند نہ کر سکے۔ بیشک یہ علمی اور مذہبی دنیا کا عظیم نقصان رہا لیکن اگر مسئلے کو اس پہلو سے دیکھا جائے کہ دین کے بیشتر بنیادی مسائل قرآن کے نصف اول میں ہیں اور ان کے بارے میں انھوں نے اپنے افکار شائع شدہ دو جلدوں میں محفوظ کر دیے ہیں تو اس نقصان کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور بات ہے۔ یہ ہے ان کا انداز فکر اور اسلوب بیان۔ اگر واقعی پوری توجہ اور انشراح صدر سے ان دونوں جلدوں کا مطالعہ کیا جائے تو ناممکن ہے کہ قاری ان کے سوچنے کے طریقے سے متاثر نہ ہو۔ اسے معلوم ہو جائیگا کہ کس ڈھنگ سے وہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے خواہشمند تھے۔ یوں ان کے دکھانے ہوئے راستے پر چل کر آپ خود بقیہ سپاروں کی تعبیر و تفسیر کر سکتے ہیں۔ گویا ترجمان القرآن محض ترجمہ اور تفسیر ہی نہیں بلکہ ایک نئی تفسیر کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔

میرے نزدیک ترجمان القرآن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونانیات اور اسرائیلیات سے کاملًا اجتناب کیا اور علوم و دعوت قرآن کو دوبارہ اپنی اصلی اور اساسی شکل میں پیش کر دیا جو شارع کا مقصود اور صدر اول کا اعتقاد تھا۔

چونکہ ترجمان القرآن میں قرآن کا ترجمہ اور حواشی ہیں اس لیے اس کی ادبی اہمیت پر کبھی توجہ نہیں دی گئی۔ حال آنکہ اس پہلو سے بھی یہ کچھ کم قابل قدر نہیں ہے۔

قرآن کے اردو ترجمے بہت ہیں۔ زیادہ نہیں آٹھ دس تو یقیناً خود میری نظر سے بھی گزرے ہونگے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لفظ زبان و بیان اور صحت و درستگی ترجمان القرآن میں ملے وہ الا ماشاء اللہ ان کے کسی پیشرو یا پیرو کے یہاں دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ مترجم کو عربی اور اردو دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہو۔ اور اس کا ادبی ذوق بھی اتنا بلند ہو کہ وہ محض معنی ہی کا خیال نہ رکھے بلکہ موزونیت متفانہ اور اردو زبان کے مزاج سے بھی

پوری طرح واقف ہو۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی ہی، ذاتی مطالعے اور مشق سے انہوں نے اردو میں بھی اہل زبان کی سی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اس پر مستزاد، قدرت کی طرف سے انہیں طبع موزوں اور شعر و ادب کا قابل رشک ذوق و دلیت ہوا تھا۔ ان سب باتوں نے بل کر ترجمان القرآن کو تخلیقی کارنامہ بنا دیا ہے۔

"الہلال" کے خاص ادبی مضامین کی طرف اشارہ کر چکا ہوں۔ لیکن اس کے بعد حالات کے تقاضے انہیں اس کوچے سے دور لے گئے۔ شعر و شاعری پہلے ترک ہو چکی تھی۔ اب ادب بھی مجبوراً اچھٹ گیا۔ حسن اتفاق سے آخری قید کے دوران میں انہوں نے بعض ادبی مضامین خطوط کی شکل میں حوالہ قلم کیے؛ جو بعد کو "غبارِ خاطر" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ "الہلال" ان کے عہدِ شباب کی یادگار ہے، "غبارِ خاطر" عہدِ کہولت بلکہ بڑھاپے کی۔ لیکن کوئی شخص اسے پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی تھکے ہوئے دماغ یا قلم کی تخلیق ہے۔ یہاں بھی ان کے ذہن کی گرم جولانی، اور قلم کی گھل افشانی میں وہی وسعت اور دلکشی ہے جو روزِ اول سے ان سے منسوب رہی۔ اسے دیکھ کر پھر ایک مرتبہ افسوس کرنا پڑتا ہے کہ علم و ادب نے ان کی ذات میں سیاست کی بارگاہ پر کتنی بڑی قربانی دی۔ اگر تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے، وہ اپنے آپ کو علم و ادب ہی کے لیے وقف رکھتے تو نہ معلوم آج اردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہو گیا ہوتا؛

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم بکلی

مولانا آزاد کی خطابت

خطابتِ دُنیا کا سب سے قدیم ذریعہ ابلاغ ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھنے کا فن ابھی ایجاد ہی نہیں ہوا تھا۔ لہذا اگر کبھی قبیلوں کے درمیان لڑائی کی صورت پیدا ہو جاتی تو لازماً ایک قبیلے کے سردار یا شیخ کو اپنے خاندان کے افراد یا اور لوگوں کو دوسرے قبیلے کے خلاف ابھارنے اور جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے، اُن سے خطاب کی ضرورت پیش آتی ہوگی۔ اسلامی عقیدہ ہے کہ دنیا میں ایک لاکھ پچیس ہزار نبی مبعوث ہوئے۔ تمام قوموں میں بزرگانِ دین کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان قابلِ احترام ہستیوں کا مقصد حیاتِ اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ وہ گم کردہ راہِ نبی نوعِ انسان کو صراطِ مستقیم کی طرف بلائیں۔ یقیناً انہوں نے بھی رُشد و ہدایت کی تلقینِ خطاب ہی کے ذریعے سے کی ہوگی۔ غرض قبیلے کا سردار رہا ہو یا کوئی شیخی مُنہی اور نبی، اس کی کامیابی اس پر منحصر تھی کہ وہ کس حد تک اپنے سامعین یا مخاطبوں کو اپنے نقطہ نظر کے صحیح ہونے کا یقین دلا سکتا ہے اور انہیں امن و ہدایت کی راہ پر گامگا سکتا ہے۔ اس طرف بہت کم لوگوں کا خیال گیا ہے کہ تمام مذاہب کی ہامی کتابیں نصیحتات سے بھری ہوئی ہیں۔ لیکن اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ان کتابوں کے اولین مخاطبوں میں تعلیم یافتہ آدمی بہت کم تھے؛ صرف گمنام کے چند لوگ پڑھنے لکھنے کے تھے۔ لہذا نبی کو اپنا پیغام لوگوں تک زبانی گفتگو سے پہنچانا پڑا۔ جب افہامِ عقیدہ کا موضوع پیش

یا وضاحت طلب رہا ہوگا، یا اس سے متعلق ان کی قوم میں پہلے سے مخالفت اور مقابلے کا جذبہ موجود تھا، انھیں دلائل سے کام لینا پڑا اور مناظرانہ رویہ اختیار کر کے ان کے معتقدات کی تردید اور تغلیط کرنا پڑی۔ یہی باعث ہے کہ ان بنیادی کتابوں میں خطبات کی بھرمار ہے۔ ان سے جہاں صاحب کتاب کی فصاحت و بلاغت کا ثبوت ملتا ہے، وہیں ہمیں اُس زمانے کی خطابت کے نمونے بھی مہیا ہو گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ خطیب کا اولین مقصد یہ ہے کہ وہ سامعین کو اپنا ہم خیال بنائے، یا انھیں کسی رائے یا تجویز پر متفق کرے۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس میں کامیابی کے لیے کئی چیزوں کی ضرورت ہے۔ موضوع ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ اس کی اہمیت کے قائل ہوں اور کسی نہ کسی درجے میں اسے اپنی زندگی یا مقاصد کے لیے ضروری خیال کریں۔ خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود موضوع کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو، اس کے موافق آراء پیش کر سکے، اور مخالف دلائل کو رد کر سکے۔ اس کے اپنے خیالات میں کسی قسم کی پرانگندگی یا تذبذب نہیں ہونا چاہیے۔ بیشک، بعض اوقات طول کلامی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ اس سے اجتناب کر سکے اور اپنا مافی الضمیر چھپتے الفاظ میں، لگی لپٹی رکھے بغیر، مدلل طریقے پر، سامعین کے سامنے رکھ سکے، تو اس کا اثر کہیں زیادہ ہوگا، بہ نسبت اس کے کہ وہ غیر واضح طور پر اکتا دینے کی حد تک بولتا چلا جائے۔ اگر اسے اپنے موضوع کی صداقت کا یقین ہے؛ اگر اسے اس کے لیے موزوں الفاظ کے انتخاب میں، اور برجستہ اور موثر طریقے سے پیش کرنے میں، مہارت حاصل ہے؛ اگر وہ اپنی تقریر کو اس حد تک اصلیت کا رنگ دے سکتا ہے کہ سامع اسے سن کر ایسا محسوس کرنے لگے کہ گویا وہ خود اس کے دل کی بات کہ رہا ہے، تو اس کی تقریر کی کامیابی میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت کی طرف سے وہ تمام صفات اور صلاحیتیں وافر مقدار میں ملی تھیں، جو کامیاب خطیب بننے کے لیے درکار ہیں۔ عالی نسبی ایسی کہ صدیوں سے اُن کا خاندان زہد و ورع اور رشد و ہدایت کا مرکز رہا تھا؛ ان کے والد مولانا خیر الدین مشائخ کے حلقوں میں معروف اور ممتاز تھے؛ مولانا آزاد خود ذاتی وجاہت اور مردانہ حسن کا نمونہ تھے؛ ان کے علم و فضل اور عربی و فارسی

پر قدرت کے سب معترف ہیں؛ طلاقِ زبان اور قوتِ بیان کے ساتھ انھیں بمثالِ حافظ کی نعمت بھی حاصل تھی۔ اور یہی چیزیں کامیاب اور موثر خطابت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ مولانا خیر الدین کے مریوں کا طبقہ خاصاً وسیع تھا، جن کی تعلیم و تربیت کے لیے انھیں اکثر ان سے خطاب کرنا پڑتا تھا؛ نیز وہ کلکتے کی جامع مسجد (مسجدِ ناخدا) میں بھی اکثر جمعے کی نماز سے پہلے حاضرین کے سامنے وعظ کہا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے سامنے یہ مثالیں ان کی کمسنی کے زمانے سے آتی رہیں۔ ممکن نہیں تھا کہ ان پر اس صورتِ حال کا اثر نہ ہوتا، اور ان کی اخلاقی طبیعت اس کے تتبع کی کوشش نہ کرتی۔ چنانچہ ہمارے پاس اس کی شہادت موجود ہے کہ وہ بچپن ہی سے تقریر کرنے اور مقرر بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ ان کی بڑی بہن فاطمہ بیگم فرماتی ہیں:

بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا شوق نہیں تھا جو اکثر بچے کھیلا کرتے ہیں۔ ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی وہ گھر کے تمام صندوق اور کسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی گڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے تھے اور ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ چلا چلا کر کہو: ہٹو، ہٹو، راستہ دو؛ دلی کے مولانا آرہے ہیں۔ ہم لوگ اس پر کہتے تھے کہ بھائی، یہاں تو کولی آدمی نہیں ہے، ہم کس کو دھکا دیں اور کہیں کہ راستہ دو۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل بنا تم سمجھو کہ بہت لوگ مجھ کو لینے اسٹیشن پر آئے ہیں۔

پھر بھائی صندوق پر سے اترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے، جیسے کہ بڑی عمر کے لوگ چلتے ہیں۔ کبھی وہ گھر میں کسی اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے تھے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم لوگ تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے پیاروں طرف کھڑے ہیں

اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ میں کہتی تھی کہ بھائی، سوائے ہم دوچار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے، ہم کیسے سمجھیں کہ ہزاروں آدمی یہاں کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے، کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

پنجابی زبان کی مثل ہے: پُوت، اکیوت کے پانو پالنے ہی سے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بچے کے بچپن ہی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ آگے چل کر کیا بننے والا ہے۔ مولانا آزاد اپنے ماحول سے متاثر ہو کر کمسنی ہی سے تحریر و تقریر پر توجہ کرنے لگے تھے۔ وہ دس برس کی عمر سے نظم و نثر لکھنے لگے اور ان کی تحریریں کلکتے اور دوسری جگہوں کے رسائل و جرائد میں چھپنے لگی تھیں۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھے، وہ اپنا ذاتی ذریعہ اشاعت چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی عمر بمشکل ۱۱-۱۲ برس کی ہوگی کہ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے "نیرنگ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے غالباً آٹھ شمارے نکلے۔ بہر حال سال کے اندر اندر یہ بند ہو گیا۔ اس کے چار پانچ برس بعد ۱۹۰۳ء میں انھوں نے اپنا مشہور ماہنامہ "لسان الصدق" جاری کیا۔ اس کی شہرت دور دور تک پہنچی اور اس کے مضامین کی سنجیدگی اور بلند پایگی کے پیش نظر بیشتر لوگوں نے خیال کیا کہ رسالے کا ایڈیٹر کوئی بزرگ اور مہتمم عالم ہے۔ انجمن حمایت اسلام، لاہور اپنے اجلاس میں ملک کے مختلف حصوں سے اہل علم و فضل کو تقریر کرنے کی دعوت دیا کرتی تھی۔ "لسان الصدق" کی تحریروں کے بلند معیار اور خطیبانہ انداز کو دیکھ کر انجمن کے اصحاب مجاز نے رسالے کے ایڈیٹر "مولانا" ابوالکلام آزاد کو بھی اپنے اجلاس اپریل ۱۹۰۴ء کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ اس وقت ان کی عمر یہی ۱۵-۱۶ برس کی رہی ہوگی۔ ممکن ہے، داعی حضرات کو انھیں دیکھ کر ان کی کم عمری سے کچھ مایوسی ہوئی ہو، لیکن ان کی تقریر سے یقیناً وہ مایوس نہیں ہوئے کیونکہ اس سے اگلے دن ان سے پھر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

یہ وہ دور ہے، جب ہندستان نے بعض مشہور خطیب و مقرر پیدا کیے۔ ان میں سے بیشتر انگریزی میں بولنے والے تھے، اور مولانا ابوالکلام آزاد انگریزی سے نابلد تھے۔ بعد کے زمانے میں انھوں نے اس زبان سے کام کاج اور مطالعے کی حد تک کے لیے خاصی واقفیت پیدا کر لی تھی، لیکن انھیں اس میں بات چیت کرنے میں ہمیشہ تکلف رہا کیونکہ وہ اپنے تلفظ سے مطمئن نہیں تھے۔ بہر حال ان کا

انگریزی میں تقریر نہ کرنا کسی طرح ان کے لیے نقصان کا باعث نہیں ہوا، نہ کسی کو اس سے انھیں کامیاب اور عظیم مقرر تسلیم کرنے میں تامل ہوا۔

ان کے خطبات کی پہلی جلد میں (جو میں شائع کر چکا ہوں) آپ کو ان کی بعض مشہور اور نمایندہ تقریریں ملیں گی۔ ان میں جہاں ان کے مطالعے اور نظر کی وسعت، اپنے مفہوم کو موزوں ترین الفاظ میں بیان کرنے پر قدرت، مفکرانہ طریقہ استدلال، اور اپنے موقف کی صداقت اور صحت پر اعتماد کا مل سطر سطر سے ظاہر ہے، وہیں آپ دیکھیں گے کہ تَكَلَّمُوا النَّاسَ عَلَىٰ قَدَرٍ عَقْوًا لَّهُمْ کے مصداق وہ اپنے سامعین کے مطابق زبان بھی بدل لیتے ہیں۔ مثلاً جمیۃ العلماء ہند اور خلافت کافرانس کے خطبات کے مقابلے میں آپ کانگریس کا خطبہ دیکھیے یا تعلیمی کانفرنس کا خطبہ ملاحظہ کیجیے چونکہ پہلے دو دنوں خطبوں کے مخاطب اہل علم مسلمان حضرات تھے، اس لیے ان کی زبان اور مسائل کی تفہیم کے لیے دلائل بھی انھیں کے معیار اور مذاق کے مطابق ہیں۔ زبان بھی نسبتاً مشکل ہے۔ دوسرے خطبوں کے مخاطب، ظاہر ہے کہ مخلوط رہے ہونگے، یہاں زبان بہت آسان ہے، جس کے سمجھنے میں کسی کو مشکل پیش نہیں آسکتی۔ لیکن ایک بات سب میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے: یہ ہے ان کا مصلحانہ اور مبشرانہ اندازِ خطاب۔ ان کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ سامع ان کی بات سمجھ جائے، پوری پوری سمجھ جائے، اور اسے اس پر عمل کرنے میں کوئی تامل یا جھجک محسوس نہ ہو۔ اسی لیے وہ ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے بار بار کہنے یا دہرانے سے دریغ نہیں کرتے۔

دیکھا گیا ہے کہ بعض حضرات کی وہ تقریریں جنہوں نے سامعین پر فوری اثر کیا تھا، جب بعد کو کاغذ پر منتقل ہوئیں، اور لوگوں نے انھیں اپنے کانوں سنا نہیں، بلکہ آنکھوں سے پڑھا، تو ان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ بعض وقتی مسائل کی تقریروں سے قطع نظر، مولانا آزاد کی بیشتر تقریروں کی یہ بھی نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ اتنے لمبے عرصے کے بعد چھاپے میں بھی اتنی موثر اور کامیاب ہیں جتنی وہ اُس وقت تھیں، جب وہ اپنے سامنے بیٹھے سامعین کو خطاب کر رہے تھے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔

مولانا آزاد کے احسانات اردو پر

مولانا ابوالکلام کا اصلی نام محی الدین احمد تھا، بلکہ غلام محی الدین احمد۔ وہ ایک ایسے خاندان کے آخری نام یوں تھے جو صدیوں علم و فضل اور تصوف اور دعوت و ارشاد کا گہوارہ رہا۔ مولانا کے والد مولانا محمد خیر الدین تھے، جو اپنی خاندانی روایات کے حامل اور عالم و فاضل ہونے کے علاوہ صوفی صافی بزرگ بھی تھے۔ ملک کے مختلف حصوں میں ان کے مریدوں کی اچھی خاصی تعداد تھی، وہ مصنف بھی تھے۔ ان کے متعدد مذہبی رسالے ہندستان اور ترکی اور مصر میں شائع ہوئے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے تعلقات حجاز سے بھی تھے اور وہاں آمدورفت بھی رہتی تھی۔ چنانچہ مولانا خیر الدین کے ایک چچا کا انتقال مدینہ منورہ ہی میں ہوا۔ "عذر" کے بعد وہ خود بھی حجاز گئے اور وہیں ایک معزز گھرانے میں شادی کر لی۔ مولانا آزاد اسی خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس طرح عربی گویا ان کی مادری زبان تھی۔ مولانا کی ولادت اگست ستمبر ۱۸۸۸ء میں مکہ میں ہوئی اور زندگی کے ابتدائی دس برس بھی وہیں گزرے۔ تعلیم شروع سے گھر پر ہوئی اور وہ بھی ٹھیٹھ مشرقی انداز کی اور دینی، عربی، فارسی کی تکمیل کی اور ۱۴-۱۵ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، تو شاگردوں کی ایک جماعت خود ان کے سپرد کر دی گئی کہ انہیں

پڑھائیں۔ یہ اس لیے کہ اس عہد میں تعلیم اس وقت تک مکمل خیال نہیں کی جاتی تھی جب تک کہ جو کچھ پڑھا ہے، وہ دوسروں کو بھی پڑھایا نہ جائے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب انھیں شاعری کا شوق ہوا۔ آزاد تخلص رکھا۔ اُس زمانے میں مولانا محمد ظہیر الحسن شوق نیومی (تلمیذ شمشاد لکھنوی) کی بہت شہرت تھی۔ وہ عربی اور فارسی کے منتہی تھے اور زبان پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ تحقیق الفاظ سے متعلق ان کی سید ضامن علی جلال لکھنوی سے جو بحث ہوئی، اس سے ان کے پایہ علمی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جلال مرحوم کی زبان کے حسن و قبح اور ساخت کے مسائل پر مجتہدانہ نظر تھی۔ ایسے مسلم الثبوت استاد کے مقابلے میں عہدہ برآ ہونا شوق ہی کا کام تھا۔ مولانا آزاد نے داغ اور امیر مینائی کا مختصر تجربہ کرنے کے بعد، غالباً اسی باعث ان کی شاگردی اختیار کی۔

۱۸۹۹ء میں انھوں نے "نیرنگ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ شائع کرنا شروع کیا۔ اس میں طرحی غزلوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ سال بھر کے اندر یہ گلدستہ بند ہو گیا۔ اس دوران میں وہ ملک کے دوسرے رسالوں اور گلدستوں میں بھی اپنا کلام بھیجتے رہے۔ ان میں مخزن (لاہور)، انتخاب (بمبئی)، اور ارمان فرخ (بمبئی) کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر کے مالک ایک صاحب عبد الحمید فرخ تھے۔ وہ ایک روزانہ اخبار بھی شائع کرتے تھے۔ منشی نوبت رائے نے بھی ایک گلدستہ "خداگ نظر" کے نام سے شائع کیا تھا۔ مولانا آزاد نے انھیں لکھا کہ آپ نظم کے ساتھ نثر کے مضمون بھی رسالے میں شامل کیجئے۔ اور یہ مضامین خود مہیا کرنے کی ذمہ داری لی۔ چنانچہ بہت دن تک نثری حصہ مرتب کر کے یہ انھیں بھیجتے رہے۔

"نیرنگ عالم" کے بند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ بہت جلد انھوں نے محسوس کر لیا کہ راجی طریقے کی شاعری میں وہ اپنے وقت کا خون کر رہے ہیں۔ یہ شعر بازی نہ تو خود ان کے نمایاں شان ہے، نہ اس سے اردو ادب ہی میں کوئی پایدار اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد واقع یہ ہے کہ گویا انھوں نے شاعری ترک ہی کر دی۔ اب انھوں نے نومبر ۱۹۰۳ء میں ایک اور ماہانہ پرچہ "لسان الصدق" کے نام سے نکالا؛ اس کا دائرہ وسیع تر تھا۔ اس میں علمی

اور ادبی اور دینی موضوعات پر نثری مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے نے آغاز ہی سے بہت شہرت حاصل کی اور علمی حلقوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے بیشتر مضامین مولانا خود ہی لکھتے۔ ان مضامین کا معیار کتنا بلند تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے:

۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت الاسلام (لاہور) کا جو سالانہ جلسہ ہوا اس کے لیے منتظمین نے ملک کے مشہور اور موقر ماہنامہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر مولانا آزاد کو بھی دعوت دی کہ وہ تشریف لائیں اور جلسے میں تقریر کریں۔ مولانا آزاد نے دعوت قبول کر لی اور لاہور پہنچے۔ منتظمین اور دوسرے حاضرین نے جب انھیں دیکھا تو انھیں یقین نہ آیا کہ پندرہ سولہ سال کے یہ صاحبزادے "لسان الصدق" کے ایڈیٹر، مرتب اور مضمون نگار ہیں۔ حاضرین میں مولانا حالی اور شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کے سے بزرگ بھی تشریف فرما تھے۔ اقبال بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ وہ اگرچہ مخزن کے ذریعہ میدان میں آچکے تھے۔ لیکن ابھی انھیں کوئی خاص شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مولانا حالی نے تو انھیں دیکھ کر یہ خیال کیا کہ مولانا آزاد نے اپنی جگہ اپنے بیٹے کو جلسے میں شمولیت کے لیے بھیج دیا ہے لیکن جب ان اصحاب نے ان کی تقریر سنی تو سب ایمان لے آئے۔

لیکن افسوس کہ "لسان الصدق" نے بھی زیادہ عمر نہ پائی۔ خوش درخشید و لے دولت مستعمل بود۔ اسی کے بعد وہ مصر اور عراق اور ایران کی سیاحت کے لیے تشریف لے گئے۔ بعض لوگوں نے غلط فہمی کی بنا پر لکھا ہے کہ انھوں نے جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی، یہ درست نہیں۔ انھوں نے یہ سفر تفریح کے لیے کیا تھا۔ ان کا تعلیمی دور اس سے بہت پہلے کلکتہ کے قیام کے زمانے ہی میں ختم ہو چکا تھا۔ واپسی پر وہ بمبئی میں رے کے اور یہیں ان کے مراسم مولانا شبلی مرحوم سے پیدا ہوئے۔ شبلی بہت کم کسی کو خاطر میں لاتے تھے۔ اس کے کچھ نفسیاتی اسباب بھی ہیں، جن کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا اپنا پایہ علم و فضل اتنا بلند تھا کہ شاگرد نادر ہی کوئی دوسرا ان کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ لیکن مولانا آزاد کے وہ بھی قائل تھے اور ان سے بہت محبت کرتے تھے، یہ ان کے اسی تعلق کا نتیجہ

تھا کہ جب وہ ندوۃ العلوم، لکھنؤ کے ماہانہ رسالے "الندوہ" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو اس کی ادارت میں انہوں نے مولانا آزاد کو بھی شامل کر لیا۔

ان ہی ایام میں مولانا آزاد چندے پہلے بمبئی میں اور پھر امرتسر میں مقیم رہے۔ بمبئی میں انہوں نے اپنے برادر بزرگ ابوالنصر غلام یسین آہ اور آغا حشر کاشمیری کے ساتھ مل کر عیسائیوں سے مذہبی مناظروں میں بھی حصہ لیا۔ اس زمانے میں امرتسر سے ایک اخبار "وکیل" ہفتے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ یہ اپنے زمانے کا بہت وقیع پرچہ تھا اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت مقبول تھا۔ مولانا آزاد ۱۹۰۶ء میں سات آٹھ مہینے اس کے مدیر رہے۔ لیکن ایک خانگی حادثے کے باعث وہ "وکیل" سے الگ ہو کر واپس کلکتہ چلے گئے۔

اب تک صحافت کے میدان میں ان کی تمام سرگرمیاں گویا ریاض کا حکم رکھتی تھیں جن کا نقطہٴ معراج ۱۹۱۲ء میں الہلال کی شکل میں ظاہر ہوا۔

یہ ہفتہ وار پرچہ روزِ اول سے اس شان سے نکلا کہ ستارہٴ درخشیدہ ماہِ کامل شد کا مصداق بن گیا۔ نہ صرف اُردو صحافت اور نشر کی تاریخ ہی میں اس کا مقام بلند ہے، بلکہ ملک کی سیاست اور جنگِ آزادی میں بھی اس کا نمایاں حصہ ہے۔ اس کی ظاہری شکل و صورت اور شان و شوکت بھی مرعوب کن تھی۔ یہ بڑے سائز اور عمدہ کاغذ پر لوسے کے سرفوں میں مصور چھپتا تھا۔ مولانا کی خطابت اور قادر الکلامی اپنی پوری قوت و عظمت کے ساتھ اس میں جلوہ گر تھی۔ ان کا بدیع اسلوب تحریر، چھٹتا ہوا طنز و مزاح، برجستہ اردو اور فارسی شعروں کا بر محل استعمال، غرض کون کون سی خوبی کی تعریف کی جائے۔

آں چہ خوباں ہمہ دارند، تو تہاداری

لیکن ان سب باتوں پر مستزاد، بلکہ اصلی اور بنیادی چیز اس کی دعوت تھی۔ دراصل یہ رسالہ صرف مسلمانوں کے لیے جاری کیا گیا تھا اور اس کا مقصد انہیں یہ یاد دلانا تھا کہ وہ کبھی خیر امتہٴ آخرجت للناس کا مصداق تھے۔ ان کے مضامین گویا اس متن کی تفسیر تھی کہ وہ کیوں "خیر امتہٴ" تھے اور وہ کیوں اپنا یہ مقام بلند کھو بیٹھے اور اب کیسے اسے دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کے مضامین میں بہت تکرار اور ادعا ہے۔ یہ اسلوب انہوں نے قرآن سے

اخذ کیا۔ چوں کہ اصل میں وہ ایک ہی بات اپنے قارئین کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے، اس لیے اسے مختلف پہلوؤں سے بار بار دہرانے کے سواے ان کے لیے کوئی اور چارہ کار بھی نہیں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ کسی ڈھپ سے ان کا مافی الضمیر سمجھ جائیں۔ اس میں انھیں لازماً مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف دعوت دینا پڑی کہ یہی ان کے تمام علوم کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنی نثر میں قرآنی آیات کے ٹکڑے استعمال کرتے تھے، یہ اعجاز سے کم نہ تھا۔ وہی آیتیں جو ہر کوئی روزمرہ سنتا اور پڑھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ ان کے معنی سمجھتا ہے، جب کسی جگہ ان کے مضمون میں آجائیں تو یوں معلوم ہوتا کہ گویا اس نے انھیں پہلی مرتبہ دیکھا ہے اور آج تک ان کے اصلی معنی اس کی نظروں سے اوجھل تھے۔

اسی سے ایک اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ یہ عام طور پر کہا گیا ہے کہ اردو نثر کو مشکل اور ناقابل فہم بنانے میں الہلال اور مولانا آزاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ اعتراض ٹھیک کم ہے اور غلط زیادہ۔ ٹھیک اس لیے کہ واقعی مولانا کی زبان الہلال کے مضامین میں مشکل تھی۔ ان کی مادری زبان عربی تھی اور ان کی تعلیم بھی تمام تر عربی اور فارسی کی رہی تھی۔ پھر چوں کہ ان کے مخاطب اصلی مسلمان تھے اور موضوع سخن بھی دینی تھا، اس لیے انھوں نے وہ زبان استعمال کی، جو اس موضوع کے لیے مناسب تھی اور جو ان کے مخاطب بھی آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ لازماً یہ زبان مشکل ہونا ہی چاہیے تھی۔

لیکن یہ اعتراض غلط ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حسن اتفاق سے مولانا کی نثر سے اردو کو بھی فائدہ پہنچ گیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ عام نثر نہیں لکھ رہے تھے اور اس سے ان کا مقصد اردو ادب کی خدمت ہرگز نہیں تھا۔ انھوں نے الہلال جاری کیا تو مسلمانوں کے لیے اور اس میں جو کچھ لکھا، وہ بھی مسلمانوں کے لیے غلطی کسی نے کی تو ان کی نقل اور تقلید کرنے والوں نے۔ میں یہاں کسی کا نام لینا نہیں چاہتا، کیوں کہ یہ آسانی سے ہر ایک ذہن میں آجائینگے۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان تقالوں نے یہ فرض کر لیا کہ جو زبان اور اسلوب مولانا اپنی تحریروں میں استعمال کر رہے ہیں، وہ ہر جگہ چل سکتا ہے۔ (یہی وہاں بعد کے زمانے میں ٹیگور کی تقلید میں ادب لطیف کی بھی چلی) یہ ”بزرگوار“ رسالوں کے عام ادبی

اور تاریخی اور تنقیدی 'غرض ہر طرح کے مضمونوں میں وہی زبان اور ترکیبیں استعمال کرنے لگے۔ جن کے مخاطب صرف مسلمان نہیں تھے، بلکہ جن کے پڑھنے والے ملک کے ہر طبقے کے لوگ تھے، جن کا زبان کا علم محدود تھا۔ جب ان لوگوں نے یہ زبان دیکھی تو وہ بجا طور پر بد کے اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ اگر اردو یہی ہے تو یہ تو مسلمانوں کے سوا اور کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔

اس میں مولانا کا کیا تصور تھا؟ مولانا کی تحریریں مقصدی اور ایک خاص طبقے کے لیے تھیں۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ان لوگوں نے یہ سوچے بغیر کہ "نہ ہر جاے مرکب تو اں ختن" اسی زبان کو عام کر دینا چاہا۔ وہ اس میں ناکام رہے اور انہیں ناکام رہنا ہی چاہیے تھا کیوں کہ ایسی زبان عام نہیں ہو سکتی۔ البتہ ان کی بے سمجھی سے یہ نقصان ضرور ہوا کہ انہوں نے اردو کے مخالفوں کے ہاتھ میں ایک حربہ دے دیا۔

الہلال سے کئی فائدے ہوئے۔ اس کے باوجود کہ مولانا کا اصل مقصد اردو زبان و ادب کی خدمت نہیں تھا، اس سے اردو نثر کو فروغ حاصل ہوا۔ اس کے متعدد مضامین ایسے ہیں کہ وہ اردو ادب میں مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ افسوس کہ ان کے اقتباس ہمارے نصاب کی کتابوں میں نہیں آئے۔ ورنہ لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اردو میں کیسے کیسے موضوعات پر کامیابی سے لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ پھر اس سے اردو میں لکھنے والوں کا ایک گروہ تیار ہو گیا اور اگرچہ نقل کرنے والوں نے نقصان بھی پہنچایا، بہر حال انہوں نے بھی زبان کی خدمت کی۔ اور شروع میں مشکل لکھنے والے بھی آخر میں کوشش کر کے سہل اور آسان زبان لکھنے لگے۔

لیکن الہلال کا سب سے بڑا فائدہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کی شکل میں نکلا۔ ہوا۔ وہ ان کے ہنگامے میں مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا تھا۔ وہ عام طور پر اس کے ذمہ دار گردانے گئے تھے اور اسی لیے انگریز کا عتاب بھی زیادہ تر انہیں پر نازل ہوا تھا۔ سر سید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کو عام سیاست میں عملاً اور کانگریس کی سرگرمیوں میں خصوصاً حصہ نہ لینے کا جو شورہ دیا تھا، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کی

مخالفت زائل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ جب تک مسلمان تعلیمی اور اقتصادی میدانوں میں ہندوؤں کی سطح پر نہ آجائیں، انھیں انگریزوں کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ لیکن غلطی یہ ہوئی کہ مسلمانوں نے اس وقتی مشورے کو اپنی مستقل پالیسی بنا لیا۔ اور سرسید کے بعد کے آنے والوں نے اس سے سربمواخراہ کرنے کو گناہ خیال کیا۔ مولانا کا احتجاج اسی پالیسی کے خلاف تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بھی برادرانِ وطن کے دوش بدوش ملک کی آزادی کی جنگ میں حصہ لیں۔ انھیں یہ بات کھلتی تھی کہ اسلام جو دنیا بھر کو "اصحر و اغلال" سے آزاد کرانے کے لیے آیا تھا، اُس کے نام لیوا آج خود اپنی غلامی پر یوں مطمئن ہیں، گویا انھوں نے یہ سبق کبھی پڑھا ہی نہیں تھا۔ وہ انھیں بار بار جھنجھوڑتے اور کچوکے دیتے کہ نیند کے ماتو! جاگو اور دیکھو کہ زمانہ کس تیزی سے آگے جا رہا ہے۔ تم کس خوابِ غفلت میں پڑے ہو! اگر اب بھی بیدار نہ ہوئے تو قیامت تک ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے اور پھر چپتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بارے ان کی کوشش رنگ لائی اور مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جس نے ملک کی آزادی کے حصول میں نمایاں حصہ لیا۔

ہر ہفتے جو لاوا مولانا کے قلم سے الہلال کے صفحوں پر منتقل ہو رہا تھا، اس سے ایک آگ سی لگ گئی۔ اس پرچے کی کامیابی اور ہردلعزیزی کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ اگرچہ اس کی قیمت چار آنے فی پرچہ تھی (جو اس زمانے کے لحاظ سے خاصی قیمت تھی) یہ ہر ہفتے بیس پچیس ہزار چھپتا تھا اور اسے کم از کم ایک لاکھ آدمی پڑھتے تھے۔ حکومت وقت بھی غافل نہیں تھی۔ اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اگر مولانا کو اسی طرح آزاد چھوڑ دیا گیا تو ان کی لگائی ہوئی آگ بتدریج اتنی پھیل جائیگی کہ پھر اسے انگلستان سے لے کر ہندستان تک کے سات سمندروں کا پانی بھی نہیں بجھا سکیگا۔

اس دوران میں اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی تھی انگریز کے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ کوئی کھلے بندوں بغاوت پھیلے۔ آخر حکومتِ بنگال نے انھیں بنگال کی حدود سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ جس

پریس میں الہلال چھٹتا تھا اس کی ضمانت ضبط کر لی۔ اس کے دفتر اور ان کے مکان کی تلاشی لی اور منجملہ اور چیزوں کے ان کے تمام سوتے بھی اٹھالے گئے۔ پرچہ بند ہو گیا۔ مولانا آزاد بنگال سے باہر رانچی (بہار) میں مقیم ہو گئے۔ بعد کو حکومت ہند نے انھیں یہیں نظر بند کر دیا۔ رانچی ہی میں انھوں نے ایک دوست (میرزا فضل الدین احمد) کی درخواست پر اپنی سوانح عمری لکھنا شروع کی جس کا نتیجہ "تذکرہ" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ انھوں نے آغاز اپنے بزرگوں کے حالات سے کیا لیکن وہ اپنے والد کے حالات سے آگے نہ بڑھ سکے۔ خود اپنے متعلق صرف چند صفحے قلمبند کیے اور ان میں بھی بیشتر اشائے اور کناہیے ہیں۔ ناشر نے ان کے لکھے ہوئے مسودے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جس کا صرف پہلا حصہ منظر عام پر آیا۔ اسی کے آخر میں ان کے ذاتی حالات کے صفحات بھی ملحق ہیں۔ دوسرا حصہ ہماری خوش قسمتی کے کیا کہنے کہ ضائع ہو گیا اور خدا معلوم، کیا ہوا!

"تذکرہ" کا اسلوب تحریر دراصل الہلال ہی کا تسلسل ہے، بلکہ یہاں یہ شراب دو آتشہ ہو گئی ہے۔ وہ صفحے کے صفحے عربی اور فارسی میں لکھتے چلے گئے ہیں۔ "تذکرہ" میں مختلف کتابوں کے حوالے کثرت سے ہیں۔ جس بے سرو سامانی کے عالم میں انھیں رانچی جانا پڑا تھا اس کا ذکر انھوں نے کتاب کے شروع میں کیا ہے۔ کتابخانہ تو درکنار گنتی کی چند کتابیں بھی ان کے پاس نہیں تھیں۔ اس صورت میں یہ ان کی قوت حافظہ کا اعجاز ہے کہ انھوں نے اتنی کثرت سے حوالے اس میں درج کیے اور کسی جگہ غلطی یا سہو نہیں ہوا۔

ربانی کے بعد انھوں نے الہلال کا نقش ثانی البلاغ کی شکل میں شائع کرنا چاہا تھا لیکن اخراجات اور کاغذ اور طباعت کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا بالآخر ۱۹۲۷ء میں انھوں نے اسے دوبارہ شائع کرنا شروع کیا اور اس کا دفتر دہلی منتقل کر دیا جو زیادہ مرکزی جگہ تھی لیکن یہ ذیل ہی منڈھے نہ چڑھتی۔ اور پرچہ پچھلے بیٹے بعد بند ہو گیا۔

گاندھی جی کے جنوبی افریقہ سے وطن آنے کے بعد مولانا ان کے ساتھ ہو گئے اور یہ ان کے کردار کے استقلال اور عظمت کی دلیل ہے کہ جو قدم انھوں نے ۱۹۲۰ء میں اٹھایا تھا، مرتے دم تک اسے پیچھے ہٹانے کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آیا۔ جیسا کہ انھوں نے

کسی جگہ لکھا ہے، زندگی کی شاہراہ کا یہی حال ہے۔ یہاں ایک مرتبہ فیصلہ کر لینے کے بعد اس راہ پر چلنے والوں میں پیچھے مڑ کے دیکھنے والے کی کوئی جگہ نہیں۔ انھوں نے سیاسی سرگرمیوں میں پورے جوش و خروش اور یکسوئی و تندہی کے ساتھ حصہ لیا۔ قید و بند کی سختیوں سے بھی ان کے پاس استقلال میں کوئی لغزش پیدا نہیں ہوئی، لغزش تو درکنار اس سے اس میں اور ثبات اور استواری پیدا ہوگئی۔ قوم نے ان کی خدمات کا یوں اعتراف کیا کہ ۱۹۲۳ء میں انھیں کانگریس کے خاص اجلاس دہلی کا صدر منتخب کیا، جو اس وقت اس کے پاس سب سے بڑا اعزاز اور انعام تھا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۳۵ سال کی تھی اور یہ کانگریس کی تاریخ میں ریکارڈ ہے۔ آج تک ان سے کم عمر کا کوئی شخص اس کا صدر نہیں ہوا۔ اس موقع پر انھوں نے جو خطبہ صدارت پڑھا تھا، اس میں کونسلوں میں داخلے کے سوال پر جس طرح مدلل بحث کی ہے اس سے ان کی بالغ نظری اور سیاسی دور اندیشی کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۹۳۲ء میں ان کے شاہکار "ترجمان القرآن" کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ شروع میں سورہ فاتحہ کی تفسیر پوری تفصیل سے قلمبند کی ہے۔ اس سے ان کے علم و فضل کی دست اور فکر و نظر کی گہرائی کا پتا چلتا ہے۔ اگر اسی شرح و بسط سے پوری تفسیر لکھی جاتی تو کتاب تین جلدوں میں بھی مکمل نہ ہو سکتی۔ اس لیے انھوں نے اس کے بعد متن کے تفسیری ترجمے اور حاشیے میں ایسے اشارے لکھ دینے پر کفایت کی کہ اگر انسان خود توجہ اور ایمان نظر سے ان پر غور کرے تو وہ آسانی سے اس کے وسیع معانی پر حادی ہو سکتا ہے۔ اس کی دوسری جلد چند برس بعد شائع ہوئی۔ تیسری جلد وہ لکھ ہی نہ سکے۔ یہ نہایت افسوس کا مقام ہے۔ مولانا اسامی طور پر عالم دین تھے۔ ان کی زندگی کے تمام دوسرے رخ اسی ایک اصل کی فرع ہیں۔ ان کی ادبیت، خطابت، سیاست۔ سب کے سوتے دین ہی کے چشمے سے پھوٹتے ہیں۔ انھوں نے دین کا علم روایتی طریقے پر حاصل کیا۔ جو کچھ اسلاف چھوڑ گئے تھے، اسے اساتذہ سے پڑھا۔ لیکن انھوں نے اسی پر قناعت نہیں کر لی۔ بلکہ جو کچھ پڑھا تھا، اسے خود اپنی عقل اور وجدان کی کسوٹی پر کسا اور حُذ مَا صَفَادَع مَا كَدَس کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اس میں سے وہ رکھ لیا جو حالاتِ حاضرہ اور تحقیقاتِ جدیدہ کے مطابق تھا، اور اسے چھوڑ دیا جو تقویم پارینہ بن چکا

تھا۔ اس کے بعد انھوں نے خود اپنے تدبیر و تفکر سے اس پر اضافہ کیا اور اس کا نتیجہ ”ترجمان القرآن“ کی شکل میں دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ ان دونوں جلدوں میں انھوں نے قرآن کے اٹھارہ پاروں کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ ادبی لحاظ سے بھی اتنا حسین اور برجستہ ہے کہ اسے ادبی تخلیق کا درجہ دیا جانا چاہیے تھا۔ افسوس کہ اس پر اس پہلو سے کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ مثال کے طور پر صرف سورہ فاتحہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

اللہ کے نام سے جو الرحمن اور الرحیم ہے۔

ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائناتِ خلقت کا پروردگار ہے

جو رحمت والا ہے؛ اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے

مالا مال کر رہی ہے؛ جو اس دن کا مالک ہے، جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں

کے حصے میں آئیگا۔ (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو

ہی ہے جس سے (اپنی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ہیں۔ (خدایا!) ہم پر

سعادت کی سیدھی راہ کھول دے۔ وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تونے

انعام کیا۔ ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے۔ اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے۔

اس عبارت پر ترجمہ کا گمان ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مصنف نے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے اسے اصل میں لکھا ہی اس طرح ہو۔

ہمارے پرانے مترجمین قرآن نے دین کی جو خدمت کی، اور جس طرح سے قرآنی علوم کو عوام تک

پہنچایا، اس کی قدر و قیمت کو کسی طرح کم کرنا مقصود نہیں۔ نہ ہم ان پر کوئی اعتراض ہی

کرتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد کے ترجمے کی صحیح قدر و قیمت اور اہلی خوبی اسی وقت واضح ہوتی ہے

جب اس کا بعض دوسرے ترجموں سے مقابلہ و موازنہ کیا جائے۔ اس سے پہلے ہمارے بیشتر

مترجموں نے قرآنی آیات کا لفظی ترجمہ اسی ترتیب الفاظ سے کر دیا جس طرح وہ قرآن میں

وارد ہوئے ہیں۔ انھوں نے اسے اردو ادب کا حصہ بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ بیشتر اردو

مخاورے اور روزمرے، بلکہ صرف دنیویہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مثالیں دینے کی ضرورت

نہیں کیونکہ یہ تراجم آسانی سے ہتیا ہو سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم ان تراجم کو اردو نثر کی

ارتقائی تاریخ میں مثلاً پیش کر سکتے ہیں، لیکن ادب کا حصہ قرار نہیں دے سکتے۔
قرآن کے یہ لفظی ترجمے ہی تھے، جنہوں نے ملا رموزی کو "گلابی اردو" ایجاد کرنے کی
راہ پر لگایا۔

بائبل کا انگریزی ترجمہ آج تک انگریزی ادب کا ذریعہ حصہ اور مسئلہ نمونہ ہے۔ اردو میں یہ
شرف صرف ترجمان القرآن کو دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ واقعی افسوس کا مقام ہے کہ
مولانا آزاد اسے مکمل نہ کر سکے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں بھی وہ کانگریس کے صدر تھے۔ کانگریس نے ۸ اگست ۱۹۴۲ء
کو بمبئی میں "ہندستان چھوڑو" (QUIT INDIA) کی قرارداد منظور کی، تو اگلی صبح متحدہ
دوسرے قومی رہنماؤں کے ساتھ وہ بھی گرفتار کر لیے گئے۔ اس قافلے کے بیشتر افراد دکن
کے مشہور تاریخی قلعے احمد نگر میں نظر بند کیے گئے تھے۔ مولانا اسی گروہ میں تھے، یہ لوگ تین
برس کے لگ بھگ یہاں رہے۔ نظر بندی کے دوران میں انہوں نے اپنے صدیق
دیرینہ نواب صدر یار جنگ، مولانا محمد حبیب الرحمن خان شروانی (مرحوم) کے نام چند خطوط
لکھے۔ چوں کہ قیدیوں کے تمام تعلقات بیرونی دنیا سے منقطع کر دیے گئے تھے۔ اور خط و کتابت
کی اجازت نہیں تھی، اس لیے ان خطوں کے ڈاک سے بھیجنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔
"ذوقِ خامہ فرسائی" کی تسکین کے لیے وہ خط لکھتے اور اسے محفوظ رکھ دیتے۔ جب ۱۹۴۵ء
میں رہا ہوئے تو بعض اجباب کے اصرار پر انہوں نے یہ ۱۶ خط "غبارِ خاطر" کے عنوان سے
کتابی صورت میں شائع کر دینے کی اجازت دے دی۔

مولانا کی نگارش کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کا اسلوبِ تحریر موضوع کے ساتھ بدلتا رہتا ہے مثلاً
اگر موضوع ہلکا پھلکا ہے تو ان کی تحریر میں شعروں کی بھرمار ہوتی ہے۔ خدا جانے ان کے حافظے
میں اردو فارسی کے کتنے شعر محفوظ تھے۔ وہ موقع کی مناسبت سے ان شعروں کو اپنی تحریر
میں کھیلتے چلے جاتے۔ اگر موضوع دینی ہو تو شعروں کا کام بالعموم قرآن کریم کی آیتوں سے

ع غالباً ہماری نئی نسل کو ملا رموزی اور "گلابی اردو" کا نام بھی معلوم نہیں ہوگا۔

لیا جاتا۔ اگر موضوع فلسفیانہ اور تاریخی ہے، تو آپ کو نہ شعر مینگی نہ آیات قرآنی، بلکہ شروع سے آخر تک مسلسل اور مدلل گفتگو صغریٰ و کبریٰ سے متعلق ہوگی۔ البتہ موضوع کچھ ہو آپ ایک چیز ہر جگہ موجود پائینگے۔ یہ ہے زبان کی شگفتگی اور ریگینی۔ جیسا کہ میں نے لکھا، ان کے ہاں تکرار اور اطناب بہت ہے۔ جو بات چند فقروں یا زیادہ سے زیادہ چند سطروں میں لکھی جاسکتی ہے وہ اس سے متعلق بھی آسانی سے دوچار صفحے لکھ جاتے ہیں۔ عام حالت میں ایسی تحریروں سے پڑھنے والے کو اکتا جانا چاہیے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ قاری ان کی تحریروں میں کچھ ایسا کم ہو جاتا ہے کہ اسے یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی بات کو بار بار پڑھ رہا ہے۔ یہ حقیقت میں تحریر کی ریگینی اور شگفتگی، ان کے اسلوب کی دلکشی اور حسن کا اعجاز ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن تحریر کی زبان و بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں میں اس درجہ گم ہو جاتا ہے کہ اسے اس میں تکرار کا احساس بھی نہیں ہوتا بلکہ جب مضمون یا کتاب ختم ہوتی ہے تو اسے اس افسوس کے ساتھ ہاتھ سے رکھنا پڑتا ہے کہ کاش یہ کچھ اور طویل ہوتی۔

اردو کو یہ اور شرف حاصل ہے کہ انھوں نے وفات سے ایک ہفتہ قبل اپنی آخری پبلک تقریر بھی اسی کی حمایت میں کی۔ ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کی سہ پہر کو لاہل قلعے اور جامع مسجد دہلی کی تاریخی عمارتوں کے درمیانی میدان میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کل ہند اردو کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد مولانا نے کوئی دس منٹ کے قریب حاضرین کو خطاب کیا اور اپنی روایتی صاف گوئی سے اردو کے مسئلے پر گفتگو کی۔ انھوں نے فرمایا کہ جب تک ملک آزاد نہیں ہوا تھا، اردو اور ہندی ایک دوسرے کی مخالفت اور حریف زبانیں خیال کی جاتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک اس بات کی دعویٰ اور امیدوار تھی کہ اسے ملک بھرتی زبان بننے کا موقع دیا جائیگا۔ اسی مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے ان دونوں کے حامی اور ملبردار اپنے اپنے دلائل پیش کرتے تھے اور حکومت اور عوام سے مدد بھی چاہتے تھے۔ لیکن اب حالات بدل گئی ہیں۔ ملک آزاد ہو چکا ہے اور ہم نے پورے غور و خوض کے بعد ایک دستور بنایا ہے۔ دستور نے فیصلہ کر دیا کہ آئندہ ملک بھرتی سرکاری زبان دیوناگری رسم خط میں لکھی ہوئی ہندی ہوگی۔ ہر نے یہ دستور منظور

کر لیا ہے اور اس کا یہ فیصلہ بھی کہ ہماری زبان ہندی ہوگی۔ اس لیے اب آزادی سے پہلے کا وہ سوال کہ ملک کی زبان ہندی ہو یا اردو ختم ہو گیا۔ ہم نے یہ جگہ ہندی کو دے دی۔ اس لیے اب ہم اردو کے حق میں یہ آواز نہیں اٹھا سکتے، نہ اٹھاتے ہیں کہ اسے پورے ملک کی ہندستان بھر کی سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔ اب اردو ملک کی چودہ علاقائی زبانوں میں سے ایک ہے۔ دستور نے اس کی یہ حیثیت تسلیم کر لی ہے (دفعہ ۳۴)۔ اب اردو بھی بنگالی، مرہٹی، گجراتی، ملیالم اور دوسری علاقائی زبانوں کی طرح ایک علاقے، ایک خطے کی زبان ہے۔ اردو کے حامیوں کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ اس کا جو حق دستور نے تسلیم کیا ہے اسے اس کے علاقے میں نافذ کیا جائے۔

یہ تھا ان کی تقریر کالب لہاب۔ اردو کا علاقہ جیسا کہ ہر ایک معلوم ہے دہلی، اتر پردیش، بہار اور پنجاب ہے۔ اردو دوستوں کا مطالبہ یہ ہے کہ جو سہولتیں بنگالی کو بنگال میں، گجراتی کو گجرات میں، ملیالم کو کیرلا میں، تمل کو مدراس میں حاصل ہیں، اردو کو ان جگہوں پر حاصل ہونا چاہیے۔

اس تقریر کے بعد مولانا کو منظر عام پر آنا نصیب نہ ہوا۔ چار دن بعد ۲۰ فروری کی صبح کو اچانک ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ تین دن غشی کی کیفیت طاری رہی۔ جہاں تک انسانی مساعی کا دخل ہے، کوئی کمی نہیں کی گئی۔ لیکن موت کا کیا علاج! آخر ۲۲ فروری کی علی الصباح انہوں نے جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ ان کی موت سے ہندستان کی جنگ آزادی کا ایک نڈر سپاہی، صفِ اول کا سیاستدان، علومِ قدیمہ و جدیدہ کا بینظیر جامع، ایک شعلہ بیان خطیب اور مقرر، اردو کا بیشمال شہکار ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَيْہِ رَاجِعُونَ

آساں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

تحریک آزادی کی مذہبی بنیاد

(افکار آزاد کی روشنی میں)

خاندانی روایت کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد کی تعلیم سراسر اسلامی علوم و فنون تک محدود رہی تھی۔ ذریعہ تعلیم عربی اور فارسی تھا۔ انگریزی پڑھانے کا کوئی انتظام کیا گیا۔ انہوں نے یہ زبان پڑھی۔ خاندان کی جو فضا تھی اور مولانا خیر الدین کے جو بے لچاک معتقدات تھے، ان کی رو سے انگریزی کافروں کی زبان تھی۔ اور اس کا پڑھنا یا پڑھانا کفر کے مرادف تھا۔ البتہ بعد کو مولانا آزاد نے خود محسوس کیا کہ انگریزی کے بغیر علوم جدیدہ کی ترقیوں اور عالمی حالات سے متعلق کچھ معلوم کرنا ممکن نہیں۔ اس پر انہوں نے اپنے طور پر انگریزی پڑھنے کا انتظام کیا۔ اور محنت اور مزاحمت سے اس میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ باسانی انگریزی کتابوں سے استفادہ کرنے کے قابل ہو گئے۔

خاندانی پس منظر اور اس تعلیم و تربیت کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ شہ دع ہی سے ان کا مزاج غلی بن گیا اور اس میں بھی جہان طبع زیادہ تر تعنیسی اور صحافتی رہا۔ چنانچہ ان کی زندگی کے ابتدائی ۲۰-۲۵ برس صحافت کی دلدلی ہی میں بسر ہوئے۔ لیکن وہ کہیں بھی رستہ ہوں۔ اسلام اور قرآن جو تمام اسلامی علوم کا منبع اور مخزن بنے، ہمیشہ ان کے غور و فکر کا محور رہا۔ قرآن ہی ان کی قرید و تقریر اور گفتار و کردار کی کسوٹی تھا۔ وہ تمام مسائل کو اسی کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ سیاست کی (یعنی جو چیز حوت عام میں سیاست کہلاتی ہے) ان کے

لاکھ عمل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس میدان میں داخل ہوئے۔ اور پھر اس حد تک اس کے ہو کے رہ گئے کہ ۱۹۲۰ء کے بعد تو علم و ادب کا مشغلہ کوئی بھولی بسری کہانی ہو گیا۔ ۱۹۲۲ء کی "ہندستان چھوڑ دو" تحریک کے سلسلے میں وہ بھی اپنے بعض دوسرے سیاسی اہباب کے ساتھ قلعہ احمد نگر میں نظر بند کیے گئے، تو یہاں کے قیام کے دوران میں انھوں نے چند مضامین اور خطوط قلمبند کیے، جو ان کی ۱۹۲۵ء میں رہائی کے بعد "غبارِ خاطر" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان میں برسوں کا ثمرہ لے دے کے یہی ایک کتاب ہے۔

۱۹۱۲ء میں انھوں نے کلکتہ سے اپنا مشہور ہفتہ وار "الہلال" جاری کیا۔ اس سے ان کا اصلی مقصود مسلمانوں کو ان کے گمشدہ مقام کی یاد دلانا اور انھیں اس پر واپس کھینچ بلانا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے جمعیتہ العلماء ہند کے اجلاس لاہور (۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء) کے خطبہ صدارت میں تفصیل سے اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

مسئلہ اہیاء ملت کا مقصود واضح ہے۔ یعنی مسلمانوں کو موجودہ پستی و

ادبار سے نکالنے اور ان کے عزت و اقبال کو واپس لانے کے لیے کیا اسباب و وسائل اختیار کرنے چاہیں! اور راہ عمل و فوز کیا ہو سکتی ہے! اس بارے میں تین مختلف مذاہب اصلاح ہیں، جو ہندستان، مصر، ترکی، ایران، ٹیونس اور بلاد ترکستان و تفقاز کے داعیان اصلاح نے اختیار کیے ہیں۔

پہلا مذہب وہ ہے جسے "اصلاح افرنجی" سے موسوم کرتا ہوں۔ گذشتہ صدی یورپ کے تمدن و صنائع کے ظہور و اعلان کا عہد تھا... جب یورپ کے تمدن کا ہوشربا جلوہ اسلامی ممالک کے سامنے بینقاب ہوا تو مختلف اثرات و مختلف جماعتوں پر مرتب ہوئے۔ غالب جماعت نے تو اپنی غفلت و جمود کی وجہ سے اس انقلاب و تغیر کی طرف نظر ہی نہ اٹھائی۔

۱. خطبات آزاد (سہ ماہیہ اکادمی ایڈیشن) ۱: ۱۰۸-۱۱۰

لیکن ایک جماعت ارباب بنیش و خبر کی بھی تھی، جس نے فوراً تغیر احوال محسوس کیا.... لیکن وہ بہ اول نظر مرعوب و مسحور ہو گئی۔ اور مہتابہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کے جذبات اس میں پیدا ہو گئے۔ ہندستان میں سرسید احمد خان مرحوم، اور ان کے متبعین و مقلدین.... وغیرہم اسی گروہ میں محسوب ہیں۔

دوسرا مذہب "اصلاح سیاسی" کا مذہب ہے۔ یہ وہ جماعت ہے، جس کی نظر اس طرف گئی کہ سب سے مقدم سیاسی اصلاح ہے.... ممالک اسلامیہ میں اس مذہب اصلاح کے سب سے بڑے داعی مرحوم سید جمال الدین اسد آبادی تھے...

تیسرا مذہب اصلاح "اصلاح دینی و اسلامی" کا ہے۔ اگرچہ اس مذہب کے دعاۃ بمقابلہ مذہب سابقہ قلیل رہے۔ مگر فی الحقیقت مسئلہ اصلاح میں یہی گروہ اصحاب رشد و ہدایت اور سالکین جاوہ انقصاد و حق کار رہا ہے.... زمانہ روز بروز ان کی دعوت سے قریبتر ہوتا گیا۔ اس آخری مسلک اصلاح کی بنیاد جن مبادی و مقدمات پر تھی، انہی کی دعوت و تبلیغ کے لیے، ۱۹۱۲ء میں انہوں نے الہلال جاری کیا تھا۔

اس سے واضح ہے کہ "الہلال" کے اجرا کی علتِ غائی "اصلاح دینی و اسلامی" تھی۔ لہذا اس امر کی بنیاد قرآن اور سنت پر رکھی گئی۔ اس کے لیے انہوں نے براہِ راست اسلام کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا (اور خود بھی اس پر عمل کیا)، جس کا حکم انہیں قرآن نے دیا تھا۔ فرمایا:

وَلَسْئَلُكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ
إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
اور دیکھو! ضروری ہے کہ تم میں سے ایک جماعت
ایسی ہو جو تبدیلی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی

۲۔ آل عمران ۳۰: ۱۰۴۔ جن میں ہر جگہ اردو ترجمہ تفسیر "ترجمان القرآن" سے لیا گیا ہے۔

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ

ہو۔ وہ نیکی کا حکم دے، بُرائی سے روکے، اور بیشک ایسے
ہی لوگ ہیں جو کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

اور پھر قرآن نے اس کے مالاً اور ما علیہ کا اضافہ کر کے زیادہ تاکید سے اس حکم کا اعادہ کیا۔
(سماتو!) تم تمام اُمتوں میں بہتر اُمت ہو جو لوگوں
(کی ارشاد و اصلاح) کے لیے ظہور میں آئی ہے۔ تم نیکی
کا حکم دینے والے، بُرائی سے روکنے والے اور اللہ پر
(سچا) ایمان رکھنے والے ہو۔ اور اگر اہل کتاب ایمان
لاتے، تو یہ ان کے لیے بہتری کی بات ہوتی۔

اور پھر قرآن نے اس کے مالاً اور ما علیہ کا اضافہ کر کے زیادہ تاکید سے اس حکم کا اعادہ کیا۔
(سماتو!) تم تمام اُمتوں میں بہتر اُمت ہو جو لوگوں
(کی ارشاد و اصلاح) کے لیے ظہور میں آئی ہے۔ تم نیکی
کا حکم دینے والے، بُرائی سے روکنے والے اور اللہ پر
(سچا) ایمان رکھنے والے ہو۔ اور اگر اہل کتاب ایمان
لاتے، تو یہ ان کے لیے بہتری کی بات ہوتی۔

پہلی آیت (۳: ۱۰۴) میں حکم ہے کہ تم میں ایک جماعت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل
کرنے والی ہمیشہ موجود رہے، تاکہ جو لوگ لاعلمی کے باعث یا کسی وقتی خوف اور طمع کے
نتیجے میں صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے ہیں، انہیں راہِ راست پر واپس لایا جاسکے۔ مسلمانوں
نے جب اس حکم الہی کو پس پشت ڈال دیا، اور اپنے فرائض منصبی سے رُود گردانی کی، تو وہ
فوز و قلاح سے بھی محروم ہو گئے، جو اسی حکم کی پابندی کا نتیجہ تھا اَوَّلَئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُونَ

دوسری محولہ فوق آیت (۳: ۱۱۰) اور بھی زیادہ اہم بلکہ بنیادی ہے۔ اس میں انہیں
خَيْرَ اُمَّةٍ کا خطاب ہی اس باعث دیا گیا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر
عمل کرنے والے ہیں۔ اگر شرط ساقط ہو جائے تو مشروط کا کیا محل! بلکہ اسی میں اسے ایمان
باللہ سے وابستہ کر دیا کہ اس حکم کی تعمیل تمہارے ایمان باللہ کا تقاضا ہے۔
قرآن نے متعدد مقامات پر بار بار یہ حکم دہرایا ہے۔ صرف ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

اور جو مرد اور عورتیں مومن ہیں، تو وہ سب ایک
دوسرے کے کارساز و رفیق ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ

پَالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ
الزَّكَاةَ يُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ

ہیں، بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور (ہر حال میں) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر عنقریب اللہ رحمت فرمائے گا۔

یہاں مومن مردوں اور عورتوں کے فرائض گنوائے ہیں۔ ان میں سلات اور زکات اور اطاعت اللہ و رسول سے بھی پہلے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے اور ان سب اعمال کو رحمت الہی کے جلب اور جذب کرنے کی علت قرار دیا ہے۔ کیا اس حکم کی اہمیت کی اس سے بڑی ترغیب ہو سکتی ہے!

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حکم کسی خاص شعبہ زندگی کے بارے میں ہے، یا اس کا اطلاق عام ہے!

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگرچہ اسلام نے زندگی کو مختلف شعبوں اور خانوں میں تو ضرور تقسیم کیا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک پوری زندگی اکالی ہے، اور اس کا مقصد صرف رضا سے الہی (رضاء اللہ) کا حصول ہے۔ آپ کو لکھا کریں — ذاتی ہو یا اجتماعی، عرف عام میں یہ دینی ہو کہ دنیوی؛ اس کی تکمیل کے لیے، آپ جو وسائل چاہیں استعمال کریں؛ آپ کا فوری مقصد کچھ بھی ہو۔ ہر حال میں نسب العین اللہ تعالیٰ کی رضا جوی ہونی چاہیے۔ یہی (قُلْ أَنْ صَلَّاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ) کا اقتضا ہے۔ گویا "میری نماز، میرا حج، اور میرا جینا، اور میرا مرنا — (غرض سب کچھ) اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے"۔ پس "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے اس حکم کا نفاذ بھی اسی مقصد حیات کی روشنی میں ہوگا۔ "معروف" اور "منکر" کا فیصلہ اور نتیجہ ایک کے کرنے کی اور دوسرے سے اجتناب کی ہدایت دینے سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا اس کے مطابق عمل حیات، انسانی کے اس ہمہ گیر نسب العین کے حصول میں معاون

ہو گا یا نہیں!

مولانا آزاد نے اہلال جاری کیا، تو سب سے پہلے اسی اصول (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے اس کی جلد اول میں سلسلہ وار تین مضمون شائع کیے۔ اور اس حکم پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا۔

حاصل سخن یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہی کر سکتا ہے جو ایمان باللہ میں راسخ اور مستقیم ہو۔ اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ محبت الہی کی راہ میں مستقیم ہو کر سب کو خدا کے لیے اختیار کرے اور سب کو خدا کے لیے چھوڑے۔ خود اس کی کوئی ذاتی محبت اور ذاتی عداوت نہ ہو۔ نہ اپنی غرض کے لیے دوست بنے، اور نہ اپنی غرض کے لیے دشمن۔ وہ ہر شے کو خدا کی آنکھ سے پیار کرے، اور اسی کی آنکھ سے دشمن کو دیکھے۔ اس کا کوئی وجود، اس کی کوئی زندگی، اس کی کوئی صدا نہ ہو۔ جب چلے تو خدا کے پاؤں سے چلے، اور جب سنے تو خدا کے کان سے سنے، اور جب بولے تو خدا کی آواز اس کے گلے سے نکلے۔

تو یہ ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مدعا اور مقصد اور نتیجہ۔

(۲)

اسی لیے انھوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم کا دائرہ وسیع کر کے مسلمانوں کو سب سے پہلے جہاد کی طرف توجہ دلائی۔ جہاد کے لغوی معنی کسی کام میں سعی بلیغ کرنے کے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں دشمن کے خلاف (خاص طور پر دفاعی جنگ میں) ہتھیار سے جنگ کرنے کے۔

۶۔ اہلال، جلد اول، شماره ۵، ۶، ۷

۷۔ اہلال، ۱: ۷ (۲۰ اگست ۱۹۱۲ء) ص ۱۲

۱۸۵۷ء کی مسلح کوشش ناکام رہی تھی۔ اس کے حالات ہندستان کی تاریخ کا خونیں باب ہے۔ اور ہمیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جب انگریزوں کا دلی پر دوبارہ قبضہ ہو گیا، تو انھوں نے انتقاماً ہندستانوں پر وہ مظالم توڑے کہ ان کے مہض سننے سے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ سیکڑوں ہزاروں بیگناہ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اور چونچ گئے، ان کی جادادیں ضبط کر کے نیلام کر دی گئیں۔ یوں بیسیوں کھاتے پیتے گھرانے مٹی میں مل گئے اور ان کے مردوزن جان و ناموس بچانے کی خاطر برسوں آوارہ گردی اور بیوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مسلمان خاص طور پر اس عتاب کا شکار ہوئے تھے۔ ہنگامہ شروع ہوتے ہی بعض علما نے جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ اور پھر تھوڑی مدت بعد آخری تاجدارِ خاندانِ مغلیہ بہادر شاہ ثانی (ظفر) کی بادشاہی کا اعلان کر دیا گیا۔ اسی لیے جب انگریزوں نے دہلی سپاہ پر فتح حاصل کر لی، تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ کانٹا ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ قائم ہوا۔ اس غریب کو بغاوت کا مجرم قرار دے کر رنگون جلاوطن کر دیا اور جو مسلمان عائد یہاں تھے، انھیں بیدست و پا کرنے کے لیے ہر طرح کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔

سر سید احمد خان مسلمانوں کی اس زبون حالی سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے اس کا دہرا علاج تجویز کیا۔ اول یہ کہ مسلمان آئندہ انگریزی حکومت کے خلاف کسی اقدام میں حصہ نہ لیں۔ دوسرا، مثبت قدم یہ اٹھایا کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کر کے زندگی کی دوڑ میں برادرانِ وطن کے معیارِ ترقی تک پہنچیں۔ لیکن بد قسمتی سے ان کے ہمنیالوں نے اس وقتی نسخے (خاص طور پر اس کے پہلے جز کو) مستقل اور دائمی علاج کا درجہ دے دیا۔

چونکہ ہنگامے کے آغاز میں مسلمان علما نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا، انگریزوں کو اس لفظ سے ایسی چڑھو گئی کہ وہ خیال کرنے لگے کہ مسلمان کی فطرت میں بغاوت ہے اور وہ مندہباً کسی کا ماتحت یا رعایا بن کر نہیں رہ سکتا۔ سر سید نے یہ داغ دھونے کے لیے "جہاد" کی طرح کی تاویلیں کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اسلام میں تلوار کے جہاد کا حکم ہے ہی نہیں؛ اور ہتھیار کے صرف بہت استثنائی حالت میں استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

اسی کے ساتھ انھوں نے انگریزی حکومت کی نعمتوں اور برکتوں پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ انھیں دل و جان سے حکومت کا فرمانبردار رہنا چاہیے۔ اس طریقہ استدلال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جب ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی تو حال آنکہ اس میں حکومت کے خلاف کول بات نہیں تھی، سرسید نے مسلمانوں کو اس میں عدم شمولیت کا مشورہ دیا۔

مسلمان اس وقت واقعی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے، حکومت کو نہ صرف ان پر اعتماد نہیں تھا، بلکہ وہ ان کے خلاف تھی۔ مساک کی بھاری اکثریت بھی زندگی کے ہر میدان میں ان سے کہیں آگے تھی۔ قدرتا وہ پریشانی میں ہر طرف ہاتھ پاتھ مار رہے تھے۔ یہ صورت حال تھی کہ ان کے کانوں میں سرسید کی یہ آواز پہنچی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ انھوں نے اسے بہت غنیمت خیال کیا۔ ادھر سرسید اور ان کے رفقاء کرام نے اس زور شور سے پراگندہ کیا کہ اگر کسی نے اس کے خلاف کچھ کہا بھی، تو وہ نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کے رہ گیا۔ غرض، سوادِ عظیم کو یقین ہو گیا کہ ان کی تمام مصیبتوں کا علاج سرسید کے تجویز کردہ نسخے ہی میں ہے۔ لہذا انھوں نے اس پر آمنا و صدقنا کہہ کر سرسید کو تسلیم کر دیا۔ اور آنکھیں بند کر کے ان کی دکھائی ہوئی راہ پر چل پڑے۔

سرسید کا مارچ ۱۸۹۸ء میں انتقال ہو گیا۔ لیکن انھوں نے مسلمانوں کو جو نصیحت کی تھی، وہ گویا مسلمانوں نے ہمیشہ کے لیے پتے باندھ لی۔ ادھر سرسید کے جانشینوں نے بھی اس میں کسی ترمیم کی ضرورت محسوس کی، نہ اس کے خلاف ہی کچھ کہا۔ یہ تھی صورت حال جب مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال منصف شہود پر آئے۔

مولانا آزاد نے سرسید کی تعلیمی پالیسی سے اتفاق کیا۔ لیکن ان کی سیاسی پالیسی کی پُر زور تردید کی۔ انھوں نے کہا کہ قرآن فرماتا ہے: **إِن الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ (۱۲ : ۴۰)** حکومت اللہ کے سوا کسی اور کا حق نہیں۔ لہذا مسلمان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا فرمانبردار نہیں ہوگا۔ اس نص کی موجودگی میں وہ کسی دوسرے کے آگے سر نہیں جھکاسکتا۔ مسلمان تو پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ وہ اس روئے زمین پر خدائے وحدہ لا شریک لہ کی حکومت و تمام

محرمے اور اس نصب العین کے حصول کے لیے جہاد کرے۔ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ (۲۲ : ۷۸) اور اللہ کی راہ میں جان لڑاؤ، اس کی راہ میں جان لڑا دینے کا جو حق ہے، پوری طرح ادا کرو۔ مولانا آزاد نے متواتر لکھا کہ قرآن کے ان صریح احکام کی موجودگی میں سرسید کا یہ کہنا کہ انگریزوں کے دل و جان سے فرمانبردار رہو اور تلوار کا جہاد ترک کر دو، کیونکر گردانا جاسکتا ہے! سرسید کی یہ تلقین سراسر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے اور اسی لیے ناقابل تسلیم و تقلید۔ انھوں نے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ انھوں نے جب سے اس حکم الہی کو ترک کیا ہے، منزل اور اوبار نے ان کا گھر دیکھ لیا ہے۔

مولانا آزاد نے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دلانے کے لیے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب یورپی استعماری طاقتیں خلافت عثمانیہ کے خلاف رزم آرا تھیں، مشرق میں بلقان کے محاذ پر جنگ ہو رہی تھی، اور مغرب میں طرابلس میں۔ مولانا آزاد نے دونوں محاذوں کی تصاویر حاصل کرنے کا خاص انتظام کیا۔ یہ ہر ہفتے جنگ کے تفصیلی حالات کے ساتھ الہلال میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ اسلامی جرنیلوں کی تصویریں اور ان کے حالات بھی چھپتے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ ان حالات اور تصویروں سے ہندوستانی مسلمانوں کو غیرت آئے، اور انھیں معلوم ہو کہ ان کے دینی بھائی کس طرح دشمنوں کے خلاف جہاد میں مشغول ہیں، جب کہ وہ غیروں کی غلامی پر قانع آرام کی نیند سو رہے ہیں۔

مولانا آزاد نے جہاد کا تصور اس بلند آہنگی سے (اور اس تواتر سے) پھونکا کہ لوگ سوتے سے چونک اُٹھے۔ بڑے بڑے علمائے اعتراف کیا کہ ہم اسلام کے اس بنیادی اصول اور حکم کو بھلا چکے تھے، مولانا آزاد نے ہمیں یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کا علم و فضل اور مقام دعوت و عزیمت کس سے مخفی ہے! پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء) کے بعد راجا مہندر پرتاپ کی صدارت میں ایک متوازی حکومت ہند افغانستان میں قائم ہوئی تھی۔ یہ شیخ الہند ہی کے ایسا پر ہوا تھا۔ ریشمی رومال کی تحریک بھی انھیں کا کارنامہ تھی۔ توخیر، ان سے متعلق مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

جب ایک مرتبہ کسی نے کہا: "حضرت آپ الہلال" اس ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، حال آں کہ اس میں تصادیر ہوتی ہیں۔ اور اس کا ایڈیٹر، مولانا ابوالکلام آزاد متشعر بھی نہیں۔ تو حضرت شیخ الہند نے فوراً یہ شعر پڑھا:

کامل اس فرمہ زہاد سے اکھٹا نہ کوئی
کچھ ہوئے، تو یہی رندانِ قدحِ خوار ہوئے

اور پھر فرمایا:

"میں الہلال کیوں نہ پڑھوں کہ یہ پہلا رسالہ ہے، جس نے ہم کو جہاد کا سبق یاد دلایا ہے، جو ہمارا فریضہ تھا اور ہم اسے بھول چکے تھے۔

مختصراً الہلال کا سیاسی مقصد دو گونہ تھا:

(۱) سرسید احمد خان کی انگریز دوستی کی پالیسی غلط اور اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔

(۲) ہندو مسلم یک جہتی، دوسرے لفظوں میں ہندستان کے مسلمانوں کو ہندو براہوران وطن کے ساتھ ملک کی آزادی کے حصول کے لیے تعاون کرنا چاہیے۔

کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ سب باتیں خلافتِ مصلحت ہیں۔ اور ان کے درست ہونے کا کوئی ثبوت یا دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ اگر مسلمانوں نے یہ روش اختیار کی تو گویا وہ ہندو "اکسٹریمیٹوں" کے ساتھ مل گئے۔ ہندستان میں ہندوؤں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ اگر ملک انگریزوں کے چنگل سے آزاد بھی ہو گیا، تو مسلمان آزاد نہیں ہونگے بلکہ ہندو اکثریت کے غلام بن جائیں گے۔ وہی آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا والی مثل ان پر صادق آئیگی۔

مولانا آزاد نے کہا کہ میں یہ بات اپنے پاس سے نہیں کہ رہا ہوں، بلکہ قرآن کہتا ہے:

لَا يَتَّخِذُ الْكُفْرُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوا فِي الدِّينِ وَلَمْ

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا بتاؤ کہ نے سے منع نہیں کرتا، جو

تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور جنہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اللہ صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے تمہیں منع کرتا ہے، جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں اور جنہوں نے تمہیں گھروں سے نکالا اور نکالنے میں (نکالنے والوں کی) مدد کی۔ جو کوئی ایسے لوگوں سے دوستی کرے گا، وہ گنہگار ہونگے۔

مولانا آزاد نے ان آیات کی بنیادی اہمیت کے پیش نظر ان پر مختلف مقامات پر لکھا ہے۔ سب سے مفصل بحث ان کے مجلسِ خلافت کے اجلاسِ آگرہ کے خطبہٴ سعادت میں ملتی ہے۔ فرماتے ہیں:

قرآن مجید نے دنیا کی تمام غیر مسلم قوموں کی دو قسمیں قرار دی ہیں... ایک تو وہ غیر مسلمان قومیں جو مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتیں، مسلمانوں کی حکومت اور خلافت پر حملہ نہیں کرتیں۔ ایسی غیر مسلم قومیں جنہوں نے نہ تو حملہ کیا ہے اور نہ مسلمانوں کی آبادیوں اور بستیوں پر حملہ کرنا چاہتی ہیں؛ ایسی قوموں کے لیے قرآن ایک لمحہ کے لیے بھی مسلمانوں کو نہیں روکتا کہ ان کے ساتھ مصالحت کریں اور بہتر سے بہتر اور اپنے سے اچھا سلوک کریں۔ لیکن جن غیر مسلمان قوموں کا یہ حال ہے کہ وہ مسلمان قوموں کے ساتھ قتال کریں مسلمانوں کو ان کی بستیوں سے نکالیں؛ ایسی غیر مسلمان قوموں کی نسبت بلاشبہ قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کر لیے جائیں۔ اور قرآن مجید کا

یہ قانون کامل انصاف اور عدالت پر مبنی ہے، جس کو خود خدا کی فطرت نے قائم کیا ہے۔ اس عالمگیر اور ہمہ گیر عدالت کی بنا پر قرآن مجید کا یہ اعلان ہے کہ ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ مسلمان کوئی ایسا تعلق نہ رکھیں، جو محبت، دوستی، صلح و وفاداری اور کسی طرح کی اعانت و نصرت کا ہو۔

اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں روکتا کہ جن نامسلمانوں نے تم سے نہ لڑائی لڑی ہے، نہ قتال کیا ہے، نہ مسلمانوں کو ان کی آبادی سے نکالا ہے، اگر مسلمان ایسے نامسلمانوں کے ساتھ اتحاد کریں، ہر طرح کی نیکی کا بہتر سے بہتر سلوک وہ کر سکتے ہیں، کریں... مسلمان بھی ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ کوئی تعلق محبت، اعانت اور نصرت کا نہیں رکھ سکتا، جو ان کی دشمن ہوں۔

اس کے بعد انھوں نے زیادہ تفصیل سے بیان کیا کہ گذشتہ کئی برس سے انگریزوں نے اسلامی ممالک کے خلاف جو رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ عراق، ایشیا۔ کوچک، قسطنطنیہ اور خود ہندستان میں جو کچھ انھوں نے کیا ہے، اور کر رہے ہیں، اس سے ثابت ہے کہ وہ اس قرآنی حکم (اور مزید گیارہ آیات قرآنیہ) کی رو سے "فریق محارب" کا درجہ رکھتے ہیں۔ پس اس صورت میں

مسلمانوں کے لیے حرام اور ناجائز ہو گیا، فسق ہو گیا اور نفاق ہو گیا، مسلمانوں کے لیے یہ قریب قریب کفر ہو گیا کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنی استطاعت کے اندر محبت و اعانت، وفاداری اور اطاعت کا کوئی تعلق رکھیں۔ اگر وہ کوئی تعلق اس طرح کا رکھیں گے، تو ایک منٹ کے لیے ان کو یہ حق نہ ہو گا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں!۱۳

یہ تھا ان کا جواب، مندرجہ صدر پہلی شق یعنی انگریز دوستی سے متعلق۔ دوسری شق یعنی ہندوؤں سے تعاون اور ملک کی جنگ آزادی کے بارے میں ان کا رویہ اور بھی صریح اور فیصلہ کن تھا۔ فرمایا: ۱۳

اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہندستان کی نجات کے لیے، ہندستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض کے انجام دینے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے جس کا اعلان میں ۱۹۱۲ء میں اہلال کے پہلے ہی نمبر میں کر چکا ہوں۔

... ہندستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر، حضور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سواہ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر، جو انہوں نے اہل مدینہ اور بت پرست و گور سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا، وہ نمونہ جو خود سرور کائنات نے عملاً پیش کیا ہے۔ اور عملاً حکماً جو تعلیم قرآن نے دی ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کا یہ فرض شرعی ہے کہ وہ ہندستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمانہ باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔ میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندستان کے سات کروڑ مسلمان ہندستان کے باہر کر ڈر ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔ اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز تھی۔ اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا: بجنسہ اس کے الفاظ ہیں: اِنَّهُ اُمَّةٌ اَحَدَةٌ ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں، نسلی کرتے ہیں

اتفاق کرتے ہیں۔ اور ہم سب مل کر ایک اُمّةٌ واحدةٌ بنتا چاہتے ہیں۔ اُمّة کے معنی ہیں قوم اور نیشن، اور واحدہ کے معنی ہیں ایک۔

یہ اشارہ ہے، اس معاہدہ کی طرف جو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ پہنچنے پر وہاں کے یہودیوں سے کیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ مکہ کے قریش اور مشرک انہیں اور ان کے ٹھہری بھرسا تھیوں کو مدینہ میں چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے، اور ضرور ان کا بیچھا کرینگے۔ اس لیے انہوں نے پیش بندی کے طور پر مقامی آبادی یہود سے (جو غیر مسلم تھے) ایک معاہدہ کیا۔ یہ ایک دستاویز ہے اور تاریخ نے اسے محفوظ رکھا ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے (جس کی طرف مولانا آزاد نے اشارہ کیا ہے)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هَذَا الْكِتَابُ مِنْ مَحْمَدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ مِنْ قُرَيْشٍ وَيَثْرِبَ وَمَنْ
تَبِعَهُمْ، فَلِحَقِّ بَهْمِمْ وَجَاهِدْ مَعَهُمْ أُمَّةً
وَاحِدَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ... الخ

اس معاہدے میں دو فریق تھے، مکے کے مہاجر اور مدینہ کے انصاری مسلمان، اور مدینے کے یہودی اور ان کے جلیف۔ معاہدے میں فریقین کو ایک اُمّة یعنی قوم (نیشن) تسلیم کیا گیا ہے۔ اس وقت ان سب کو مکہ کے غیر مسلم اور مشرک قریش کے حملے کا اندیشہ اور خطرہ تھا؛ دونوں فریق اس کا مقابلہ کرنے کے لیے متفق ہو گئے؛ اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مشترک دشمن کے خلاف ایک قوم ہیں۔ مولانا آزاد نے اس سے یہ استدلال کیا کہ ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی انگریزوں کے مقابلے میں وہی پوزیشن ہے، جو مدینے کے مسلمانوں اور یہودیوں کی قریش مکہ کے مقابلے میں تھی۔ پس، اگر وہ اپنے تمام مذہبی

اور تمدنی اختلافات کے باوجود مشترک دشمن کے مقابلے میں ایک قوم ہو سکتے تھے، تو آج ہندستان کے باشندوں کو ایک قوم کہلانے اور بننے میں کیا مانع ہے! بلکہ اتباع سنت کے باعث یہ مسلمانوں کا فرض ہے۔

پھر اس مسئلے پر زیادہ زور دینے کے لیے کہا: ^{۱۵}

میں اپنی زندگی کا اگر کوئی کام سمجھتا ہوں، تو وہ یہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ہندستان کے ان انسانوں میں ہوں جن کو خدا نے کتاب اللہ کی طرف بلایا ہے۔ میں اپنے لیے کوئی خدمت سمجھتا ہوں تو وہ صرف یہی ہے کہ کتاب اللہ کی طرف لوگوں کو بلاؤں۔ مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے تمام کاموں میں الگ تھلگ تھے۔ علی گڑھ کی پلیسی مسلمہ قومی پلیسی سمجھی جاتی تھی کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ رہیں۔ میں نے دعوت دی کہ اگر مسلمان ہندستان کی زندگی میں بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے عظیم الشان فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہونا چاہیے کہ اتفاق کا قدم بڑھائیں، اور بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں۔ مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ان کے مذہبی عمل میں سے تھا۔

پھر دنیا نے دیکھا کہ ہندو مسلم اتحاد کا اصول تمام ہندوستانیوں کا ایمان بن گیا۔ اس کے نتائج ہم سب کے سامنے ہیں۔

انگریزی حکومت مولانا آزاد اور اہلال کی ان سرگرمیوں سے غافل نہیں تھی، اس لیے ان کے نتائج کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو سکتی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۰۶ء کو مولانا آزاد کو کلکتہ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ اس پر وہ رانچی (جہاں پیپے اور اس کے مضافات میں مور آبادی بستی میں مقیم ہو گئے۔ جولائی ۱۹۱۶ء) میں حکومت نے انہیں وہیں نظر بند کر دیا، تاکہ وہ کسی اور جگہ منتقل نہ ہو سکیں۔

اس نظر بندی سے وہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں رہا ہوئے۔

(۳)

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کے خاتمے کے قریب شمالی ہند میں سیاسی بھیمتی اپنے پورے شباب پر تھی۔ دلی اور پنجاب خاص طور پر اس سے بہت متاثر تھے۔ مخالفت کی آگ اندر ہی اندر سگ رہی تھی۔ حکومت نے اسے کچلنے کے لیے رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا۔ گاندھی جی جنوبی افریقا سے ہندستان واپس آچکے تھے اور انھوں نے اپنا ستیاگرہ کا تجربہ یہاں نیا نیا رائج کیا تھا۔ ۲ مارچ ۱۹۱۹ء کو انھوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے طور پر ۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو ملک گیر ہڑتال کریں۔

دلی کی مرکزی حیثیت مسلم تھی۔ یہاں سوامی شردھانند اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خان ہمارے سیاسی لیڈر تھے۔ ان دنوں گاندھی جی بھی یہیں دلی میں مقیم تھے۔

۳ مارچ کو دلی میں ہڑتال بہت پُرامن طریقے پر شروع ہوئی۔ لیکن حکومت اور نوکر شاہی عاقل نہیں تھی، بلکہ اپنے ہتکنڈوں سے پورے طور پر پریس تھی۔ فساد بہت معمولی بتا پر شروع ہوا۔ دلی ریلوے اسٹیشن پر ستیاگرہیوں نے ایک حلوائی سے دکان بند کرنے کو کہا۔ اس پر فوراً پولیس نے مداخلت کی اور کچھ ستیاگرہیوں کو حراست میں لے لیا۔ قدرتاً بھڑک جھج ہو گئی۔ اس پر فوج بلائی گئی اور فساد شروع ہو گیا۔ فوج نے گولی چلا دی۔ بھگدڑ مچنا ہی تھی۔ لوگ کینسی باغ کے رستے سے بھاگے ہوئے گھنٹہ گھر (مرحوم) کے سامنے سے چاندنی چوک میں داخل ہوئے۔ یہاں کچھ اور فساد ہوا اور فوج نے دوبارہ گولی چلائی۔ سرکاری اعلان کے مطابق اُس دن پانچ آدمی موقع پر جان بحق ہوئے اور چودہ زخمی۔ (ایک بعد کو زخموں کی تاب نہ لا کر پل بسا)

جونہی سوامی شردھانند کو گولی چلنے کی خبر ملی، وہ پہلے ریلوے اسٹیشن پہنچے اور اس کے بعد چاندنی چوک آگئے۔ انھوں نے ستیاگرہیوں اور عوام کو سمجھایا بھجایا، اور ہجوم کے ساتھ پیپل پارک کی راہ لی۔ یہاں جلسہ ہوا جس میں انھوں نے لوگوں سے خطاب کیا اور انھیں پُرامن اور

منظم رہنے کی تلقین کی۔ جلسے کے اختتام پر وہ پیدل اپنے مکان کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ چاندنی چوک سے گزر رہے تھے اور خاصی بڑی بھیڑ ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی کہ سامنے سے ایک فوجی دستے نے اُن کا راستہ روک لیا۔ اس دستے میں تمام سپاہی منی پور کے تھے (اور غالباً یہ دانستہ کیا گیا تھا)۔ چونکہ وہ ہندی سے نابلد تھے، اس لیے وہ سوامی شرودھانند یا کسی اور کی کوئی بات سمجھنے سے قاصر تھے۔ اتنے میں، خدا معلوم کیسے، اتفاق سے ایک بندوق چل گئی۔ اس پر بھیڑ مشتعل ہو گئی اور فوجیوں کی طرف بڑھی۔ فوجیوں نے بندوقیں چھتیا لیں۔ قریب تھا کہ وہ فیر کر دیں کہ فوراً سوامی شرودھانند ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے۔ انھوں نے اپنا سینہ ننگا کر لیا اور فوجیوں سے کہا: لو، اگر گولی مارنا ہے، تو میں حاضر ہوں۔ فوجی جو ہندی نہیں سمجھتے تھے، اس نظارے پر ہکا بکارہ گئے کہ اب کیا کریں۔ خوش قسمتی سے اسی وقت ایک انگریز افسر موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے بیک نظر حالات کا جائزہ لیا اور فوجیوں کو حکم دیا کہ بندوقیں نیچی کر لیں اور واپس چلے جائیں۔

رسیدہ بود بلائے، ولے بنجر گذشت۔ سوامی شرودھانند کی جان بچ گئی۔ لیکن ان کے اس جرات مندانہ بلکہ مہمورانہ اقدام نے انھیں چشم زدن میں دلی کامجوب ترین اور مقبول ترین لیڈر بنا دیا۔ ہر ایک کی زبان پر تھا کہ یہ ایک شخص ہے جو کسی صورت اپنی جان کی قربانی دینے سے نہیں جھجکتا اور سب سے آگے بڑھ کر سینہ تان کر گولی کھانے کو تیار ہے۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کے نقطہ عروج کا زمانہ تھا۔ ہر طرف "مہاتما گاندھی کی جے" اور "نعرۃ تجبیر" بیک آواز ہندو مسلمانوں کی زبان پر تھے اور سب شانہ بشانہ آزادی کی جنگ میں آگے بڑھ رہے تھے۔

اگلے دن (۳۱ مارچ) "شہیدوں" کی یاد میں تعزیتی جلسہ ہوا۔ سوامی شرودھانند نے بھی اس میں تقریر کی۔ ۲ اپریل کو جامع مسجد ادلی کی طرف سے اعلان ہوا کہ ظہر کی نماز کے بعد ۳ مارچ کے ہنگامے میں مرنے والوں کو خراج عقیدت ادا کیا جائے گا۔ اس دن بعض مسلمان، مابعد شہر سوامی جی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ جامع مسجد میں لوگوں سے خطاب کریں۔ چنانچہ سوامی جی جامع مسجد گئے اور وہاں انھوں نے

نماز کے بعد لوگوں کے سامنے تقریر کی۔

یہ اپنی نوعیت کا غیر معمولی اور نادر واقعہ تھا۔ جامع مسجد میں بھگوے کپڑوں میں ملبوس کسی (غیر مسلم) سیاسی کارکنوں سے خطاب کرنا۔ ایسا نہ کبھی اس سے قبل دیکھنے سننے میں آیا تھا، نہ اس کے بعد کبھی ایسا ہوا۔

لیکن اس کے جلد بعد ہی بعض اسلامی حلقوں میں اس کا ردِ عمل شروع ہوا۔ انہوں نے سوامی شر دھانند کی مسجد میں تقریر کرنے کو ناجائز بلکہ سخت فتنہ اور بدعت سے تعبیر کیا اور لکھا کہ اس سے مسجد کی بے حرمتی ہوئی ہے اور اس کے احترام کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ بعض لوگوں نے لکھا کہ "مسلمانوں کو چاہیے کہ احکامِ شرعیہ کو مقدم رکھیں اور جوشِ اتحاد میں ایسے بخود نہ ہو جائیں کہ احکامِ شرعیہ سے بے پروا ہو جائیں۔"

معاملہ بنیادی طور پر سیاسی نوعیت کا تھا اور اس سے بہت دور رس نتائج مترتب ہونے والے تھے۔ لہذا جو نہی یہ خبر مولانا ابوالکلام آزاد کو پہنچی جو اس زمانے میں (جیسا کہ لکھا جا چکا) رانچی میں نظر بند تھے کہ کچھ لوگ سوامی شر دھانند کے جامع مسجد میں داخلے اور وہاں تقریر کرنے پر اعتراض کر رہے ہیں اور اسے غیر اسلامی اور خلافِ شریعت فعل سمجھتے ہیں تو انہوں نے فوراً ایک مفصل مضمون قلمبند کیا جس میں اس مسئلے کا اسلامی نقطہ نظر سے شرح و بسط سے جائزہ لیا۔ یہ مضمون پہلے مشہور علمی رسالے "معارف" عظیم گڑھ میں چھپا، اور اسی زمانے میں الگ سے کتابی شکل میں بھی بعنوان "جامع الشواہد فی دخول غیر مسلم فی المساجد" شائع ہوا۔

اس میں انہوں نے صدر اسلام میں خود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے متعدد واقعات سے استدلال کیا اور بتایا کہ غیر مسلموں کا مسجدوں میں داخلہ کبھی ممنوع نہیں رہا۔ آنحضرت صلعم نے غیر مسلموں بلکہ مشرکوں تک کے دُفد سے مسجدِ نبوی (مدینہ) میں ملاقات کی، انہیں وہاں ٹھہرایا، انہیں مسجد میں اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی اجازت دی۔ مثلاً

اول۔ یمن میں عیسائیوں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ اسلام کی دعوت وہاں پہنچی تو رفتہ رفتہ

مسلمانوں کی ان سے راہ و رسم پیدا ہوگئی۔ بالآخر وہاں کے شہر نجران کے عیسائیوں نے تحقیق کے لیے ۶۰ آدمیوں پر مشتمل ایک وفد مدینہ بھیجا۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے، تو حسب معمول ان کی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد نبوی میں ملاقات ہوئی۔ یہ اتوار کا دن تھا اور مغرب کا وقت قریب تھا۔ وفد کے اراکین نے بات چیت سے پہلے عبادت کرنی چاہی۔ بعض مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا کہ وہ مسجد میں عیسائیوں کے طریقے پر عبادت کریں۔ لیکن آنحضرتؐ نے انھیں اجازت دینے کا حکم دیا۔ اس پر ان عیسائیوں نے مشرق کی طرف منہ کیا اور نماز ادا کی۔ اس ایک واقعے سے کسی استنباط ہوتے ہیں :

(۱) غیر مسلم مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں۔

(۲) غیر مسلم اسلامی مسجد میں اپنے طریقے پر عبادت کرنے کا مجاز ہے۔ (مسجد کا مصرف ہی عبادت الہی کے لیے جگہ مہیا کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص اس میں عبادت کرے، بشرطے کہ اس میں شرک یا بت پرستی کا شائبہ نہ ہو، تو یہ تو مسجد کے عین مقصود کے مطابق ہے)

(۳) اس وفد میں (۶۰) آدمی تھے۔ گویا یہ عبادت (نماز) دو چار آدمیوں کا انفرادی یا پوشیدہ عمل نہیں تھا، بلکہ اچھے خاصے مجمع نے مسلمانوں کی موجودگی میں، اپنی نماز ادا کی۔

دوم۔ ممکن ہے کہ وفد نجران کے عیسائی ہونے سے کسی کو یہ خیال گزرے کہ اہل کتاب کو مسجد میں آنے کی اجازت ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں طائف سے بنو ثقیف کا جو وفد آیا، وہ لوگ مشرک اور بت پرست تھے۔ وہ نہ صرف مسجد میں آئے، اور ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور گفتگو ہوئی، بلکہ آپ نے انھیں مسجد میں ٹھہرنے کی اجازت دی، اور ان کے لیے سخن مسجد میں خیمہ نصب کرایا گیا۔

سوم۔ تیسرا واقعہ ثمامہ بن اثمال کا ہے، جو مشرک تھا۔ وہ نجد کا رئیس تھا۔ ۵ھ میں

آنحضرتؐ نے اس کو گرفتار کرا کے مدینہ بلوایا۔ اور یہاں آنے کے بعد اسے مسجد نبوی میں ایک ستون سے بندھوا دیا۔ تین دن تک وہ اسی طرح بندھا رہا۔ پھر اسے آپ کے حکم سے بلا شرط رہا کر دیا گیا۔

غرض ان تمام واقعات سے ثابت ہے کہ غیر مسلموں اور مشرکوں کا داخلہ مسجد میں جائز ہے؛ ان کا مسجد میں قیام جائز ہے؛ اور ان کا مسجد میں اپنے طریقے پر عبادت کرنا بھی جائز ہے بشرطے کہ اس میں کوئی عنصر شرک کا نہ ہو۔

ان واقعات کے بیان سے مولانا آزاد نے یہ نتیجہ نکالا ہے؛ لکھتے ہیں:

مسجدوں کا احترام یہ ہے کہ اس میں انسانوں کی بھلائی کے لیے انسانوں کا اجتماع ہو۔ اسلام نوع انسانی کی عظمت و احترام کے لیے آیا ہے، نہ کہ تذلیل و تحقیر کے لیے۔ پس، وہ کسی انسان کو بہ حیثیت ایک انسان نجس قرار نہیں دیتا، جس کی چھوت سے مٹی اور اینٹ ناپاک ہو جائے۔ اسلام کی دینی عمارت صرف مسجد ہے اور کوئی نہیں۔ پس اگر اسلام غیروں کو قبول کرنا چاہتا ہے، تو مسجد ہی میں قبول کرنا پڑے گا۔ آج اگر ہمارے ہندو بھائی خود اپنی محبت اور پیار سے ہماری مسجدوں میں آتے ہیں، تو یہ وہ چیز ہے، جس کی خود ہم کو آرزو کرنی تھی۔ اور جس کو آدل دن سے شروع ہو جانا چاہیے تھا۔

ہماری جنگ آزادی کی کامیابی کا انحصار ہندو مسلم اتحاد کی مضبوطی اور پایداری پر تھا۔ آج جب کہ ہم یہ سب مراحل طے کر کے اپنی منزل مقصود پر پہنچ چکے ہیں، ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مولانا آزاد کے اس فتوے کا کتنا مثبت اور ہمہ گیر اثر ہوا تھا۔

(۴)

پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء) کے شروع ہوتے ہی حکومت ہند نے ہندستانی ریلے عام

سے استصواب کیے بغیر، بلکہ اس کے خلاف منشا ہندستان کی طرف سے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ انگریز قیصر ہند تھا؛ اسے ہم سے پوچھنے کی ضرورت بھی کیا تھی! اقتدار اس کے ہاتھ میں تھا، اور حکومت کے تمام وسائل اور کل پُرزے اس کے اشارہ ابرو پر چلنے کو تیار، اس لیے وہ من مانی کرنے میں آزاد تھا۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس اور دوسری جماعتوں کے اکابر کے اعتراض اور احتجاج کی کوئی پروا نہ کی گئی اور ہندستان فریق جنگ قرار دے دیا گیا۔

جنگ ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو شروع ہوئی، تو اس وقت فریق مخالف صرف جرمنی تھا۔ یکم نومبر ۱۹۱۴ء کو ترکیا نے بھی انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اب جرمنی اور ترکیا ایک طرف؛ اور انگریز اور فرانس اور روس ان کے مقابلے میں دوسری طرف تھے۔ اس سے ایک نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔ آج تک جنگ جرمنی کے خلاف تھی، جس سے ہندستانی مسلمانوں کو کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔ لیکن اب ترکیا بھی جرمنی کا حلیف بن گیا۔ ہندستانی فوج کا بڑا حصہ یہاں کے مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اور ترکیا کا عثمانی سلطان، صرف ترکیا ہی کا حکمران نہیں تھا، بلکہ وہ خلیفہ المسلمین اور امیر المؤمنین بھی تھا، اور اس کی یہ حیثیت پوری دنیا کے مسلمانوں کو تسلیم تھی اور اس کا اعلان وہ ہر ہفتے جمعہ کے خطبے میں کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اگر ہندستانی فوج محاذ جنگ پر جاتی ہے، تو اس کے مسلمان سپاہیوں کو خلیفہ اسلام کے خلاف بھی جنگ کرنا پڑے گی، جو اسلام کے معتقدات کی رُوت کسی عنوان جائز اور قابل برداشت نہیں تھی۔

مسئلے کا یہ نازک منہاں پہلو انگریز حکومت سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے بطور شہ بندی حکومت برطانیہ کے ایما پر حکومت ہند نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے، ترکیا کے جنگ میں شامل ہوتے ہی (۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو) یہ اعلان کیا:

۱۸۔ اس اعلان کا اُلٹا سیدھا ترجمہ "مسئلہ خلافت" (اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی: ص ۳۳-۳۴) میں بھی چھپا ہے۔

برطانیہ عظمیٰ اور ترکی میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ برطانیہ کو اس کا سخت افسوس ہے۔ دولت عثمانیہ کا یہ فیصلہ غلط مشورے کے تحت، اور کسی اشتعال کے بغیر، عمداً ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ہزاریکھنسی وائسرائے ہند ہنزہ میجسٹری کی گورنمنٹ کے حکم کے مطابق عرب کے مقامات مقدسہ کے بارے میں، جن میں عراق کے متبرک مقامات اور بندرگاہ جدہ بھی شامل ہیں، اعلان کرتے ہیں، تاکہ ہنزہ میجسٹری کی نہایت وفادار مسلم رعایا کے دل میں کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو :

(۱) اس جنگ میں مذہبی جنگ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

(۲) ان مقامات مقدسہ اور بندرگاہ جدہ پر برطانوی بری و بحری طاقت سے کبھی حملہ نہیں کیا جائے گا، نہ انھیں کوئی اور نقصان پہنچایا جائیگا۔

(۳) ان مقامات مقدسہ کو جانے والے زائرین اور حجاج سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا۔

(۴) ہنزہ میجسٹری کی گورنمنٹ کی استدعا پر فرانس اور روس کی حکومتوں نے بھی اسی طرح کا یقین دلایا ہے۔

حکومت ہند نے یہاں اس اعلان کی وسیع اور ملک گیر پیمانے پر اشاعت کا خاص انتظام کیا۔ ہر ایک صوبے کے صدر مقام سے، ضلع سے، بلکہ ہر ضلع اور شہر کے مسلمانوں کو جمع کر کے مقامی سرکاری افسر نے یہ اعلان ان کے سامنے پڑھا (اور غالباً یہ چھوٹے چھوٹے اشتہاروں کی شکل میں تقسیم بھی کیا گیا تھا) مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کو یقین دلایا جائے کہ

(۱) یہ جنگ مذہبی نہیں، بلکہ سیاسی (اور دفاعی) ہے۔ حملہ ترکیا نے کیا ہے، انگریزوں نے ترکیا پر حملہ نہیں کیا، انگریزوں نے اپنے بچاؤ کے لیے، مجبوراً ترکیا کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

(۲) انگریزی حکومت خلیفۃ المسلمین کے خلاف نہیں ہے، بلکہ ترکی حکومت اور وزارت کے خلاف لڑنے پر مجبور ہو گئی ہے، جنہوں نے عمداً، کسی اشتعال کے بغیر، انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔

(۳) اسلامی مقامات مقدّسہ (جزیرۃ العرب، جدہ، عراق وغیرہ) کی حرمت قائم رہیگی۔ اور انہیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچایا جائیگا۔

اس وقت حکومت کو ہندوستانیوں کی (اور مسلمانوں کی) مادی اور معنوی امداد کی اشد ضرورت تھی، فوج میں بھرتی کے لیے مسلمان سپاہیوں کی اور جنگ جاری رکھنے کے لیے روپے کی اس ضرورت اور مجبوری کے پیش نظر حکومت نے یہ وعدہ تو کر لیا، لیکن رہا اس عہد کا ایفا، یہ نہ اس کی نیت تھی، نہ یہ اس کے بس ہی میں تھا۔ اگلے تین چار برس میں مسلسل خلا و ریزیوں سے جس طرح اس اعلان کی مٹی پلید ہوئی، وہ تاریخ کا المناک باب ہے۔

جرمنی نے پوری تیاری کے بعد جنگ شروع کی تھی۔ اس لیے ابتدائی مراحل میں اسے ہر میدان میں کامیابی حاصل ہوئی اور انگریزوں اور اتحادی فوجوں کو ہر محاذ پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ حالات کی یہ رفتار ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء میں (بلکہ ۱۹۱۶ء کے آخر تک) مسلسل قائم رہی۔ اس کے بعد امریکا بھی جنگ میں کود پڑا، اور یوں جرمنی کے خلاف اتحادیوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔ یہ تازہ کمک پہنچ جانے کے بعد اتحادی فوجیں بتدریج پیش قدمی کرنے لگیں۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے یورپ کے وہ علاقے واپس لے لیے، جو کھیلے دو ڈھائی برس میں جرمنی نے فتح کیے تھے۔ حکومت ہند کے محولہ فوق اعلان کے باوجود ایشیا میں خلافت عثمانیہ کے بیشتر علاقوں — عراق، شام، لبنان، بیت المقدس، فلسطین — سب پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ بلکہ عین جزیرۃ العرب بھی انگریزی سازشوں اور ریشہ دہنیوں کا مرکز بن گیا، اور شریف مکہ سے خلیفۃ المسلمین کے خلاف بغاوت کرا دی گئی۔ قصہ کوتاہ ۱۹۱۶ء کے آخر تک جنگ کا نقشہ اس حد تک بدل چکا تھا کہ اصحاب خبر و دانش کو یقین ہو گیا کہ جرمنی جنگ ہار گیا ہے؛ اب وہ اتنا جب تک چاہے، طول دے لے، بہر حال اس کی فتح ممکن نہیں، اور بالآخر اسے ہتھیار ڈالنا پڑیگا۔

یہ تھی صورت حال ۱۹۱۸ء کے آغاز میں۔ اب انگریزوں کو اطمینان ہو گیا تھا کہ ہم جنگ جیت چکے ہیں۔ اور جرمنی اور اس کے حلیفوں کے خلاف اقدام کرنے پر کوئی ہمیں روکنے والا نہیں۔ اب ان کے دل میں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ بھی

کم ہی رہ گیا تھا۔ چنانچہ برطانوی وزیر اعظم (مسٹر لائیڈ جارج) نے ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو اپنی تقریر میں کہا:

ہم جنگ اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ ترکیا کو اس کے پایہ تخت سے محروم کر دیں، یا ایشیا کے کوچک اور تھریس کے زرخیز اور اہم علاقے اس سے چھین لیں، جن میں ترکی نسل کی آبادی کی اکثریت ہے۔ ہم اس بات کے بھی مخالف نہیں کہ جن علاقوں میں ترکی نژاد آبادی ہے، وہاں بدستور ترکی کی حکومت قائم رہے اور قسطنطنیہ ہی اس کا پایہ تخت رہے۔ البتہ بحیرہ روم اور بحیرہ اسود کو ملانے والے بحری رستے کو بین الاقوامی انتظام اور نگرانی میں رہنا چاہیے۔ ہماری رائے میں عرب، آرمینیا، عراق، شام اور فلسطین بھی اپنی اپنی الگ آزاد قومی حکومتوں کے مستحق ہیں۔

جن لفظوں میں یہ تقریر کی گئی، اور ان میں جو عزائم مضمون تھے، پوری احتیاط کے باوجود وہ کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں گویا سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ اور خلافت عثمانیہ کا تصور قومی حکومتوں کی بھیجٹ چڑھا دیا گیا۔

اس کے تین دن بعد (۸ جنوری ۱۹۱۸ء) امریکا کے صدر ووڈرو ولسن نے اپنے شہرہ آفاق چودہ نکات کا اعلان کیا، جو بالآخر اختتام جنگ کے بعد صلح نامے کی بنیاد ثابت ہوئے۔ ان میں کا بارھواں نکتہ یہ تھا:

ترکی کو یقین دلایا جائے کہ موجودہ سلطنت عثمانیہ میں جو ترکی حصہ ہے، وہ بدستور اس کے قبضے میں رہے گا۔ لیکن جو دوسری اقوام سلطنت ترکی کے زیر اقتدار ہیں، انہیں بھی اس امر کا اطمینان دلایا جائے کہ ان کی جان و مال بھی محفوظ رہے گی، اور ان کی ترقی میں کوئی چیز حاصل نہیں ہوگی۔ ان اعلانات سے ہندستان کے مسلمانوں میں بھیمتی اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ جرمنی کی توکے

فکر تھی۔ لیکن ترکیا اور سلطنتِ عثمانیہ اور خلیفۃ المسلمین کے ساتھ مسلمانوں کے صدیوں کے گہرے دینی اور جذباتی تعلقات تھے۔ اگر حکومتِ ہند کا ۲ نومبر ۱۹۱۲ء کا اعلان اور وعدہ موجود تھا، جس میں 'فتح کی صورت میں، ترکیا اور خلیفۃ المسلمین کے مفاد کی حفاظت کی یقین دہانی کرائی گئی تھی، لیکن اس کے باوجود لوگوں کو پورا اطمینان نہیں تھا، گو آج تک کسی نے کھل کر بات نہیں کی تھی۔ اب وزیر اعظم انگلستان اور صدر امریکا نے جو یہ بیان جاری کیے، تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں۔ اور انھیں محسوس ہوا کہ ان کے اندیشے حقیقت کی شکل اختیار کرنے والے ہیں۔

۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہو گئی، اور جرمنی کی شکست پر مہر لگ گئی۔ اب فریقین کے درمیان صلح نامے کی باتیں فضا میں تھیں۔ ان دنوں طرح طرح کی افواہیں اور چہ میگوئیاں گشت لگا رہی تھیں۔ ہر ایک کی زبان پر تھا کہ مملکتِ عثمانیہ کے تمام علاقے اس سے الگ کر دیے جائیں گے۔ ایسے میں مسلمانوں کی گہراہٹ اور تشویش قدرتی بات تھی۔ اس بگڑتی حالت کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے، ۱۹۱۹ء کے شروع میں، بمبئی کے بعض سرگرم اور دردمند اصحاب نے "بمبئی خلافت کمیٹی" قائم کی۔ اس کے صدر بمبئی کے مشہور تاجر سیٹھ میاں جامد چھوٹانی اور سکتر حاجی احمد صدیق کھتری تھے۔ انھوں نے اس کمیٹی کی تشکیل اور لائحہ عمل کی تفصیلات کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔ لیکن علما کے طبقے میں بھی سب محسوس کر رہے تھے کہ، اگر جلد کوئی موثر اقدام نہ کیا گیا تو خلافتِ عثمانیہ کا نام نشان تک ہمیشہ کے لیے ناپید ہو جائیگا۔ اور یوں اسلامی دنیا اپنے ایک بنیادی دینی ادارے سے محروم ہو جائیگی۔ چنانچہ اس مسئلے پر غور و فکر کے لیے ۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ میں علما کا ایک اجتماع ہوا جس میں فیصلہ ہوا کہ مرکزی خلافت کمیٹی "قائم کی جائے۔ اس کے لیے "بمبئی خلافت کمیٹی" کے عہدے دار برقرار رکھے گئے اور عارضی طور پر اس کا دفتر بھی بمبئی ہی میں رکھنے پر اتفاق ہو گیا۔

اس نئی تنظیم کا پہلا کل ہند اجلاس بہ صدارت فضل حق، کلکتہ، ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔ گاندھی جی ۱ جو ۱۹۱۵ء میں ہندوستان واپس آچکے تھے، اس جلسے میں موجود تھے۔ کانفرنس میں مختلف تجویزیں پیش ہوئیں کہ اگر انگریز اور اتحادی اپنی مخالف ترکیب پالیسی

پر مقرر رہیں، تو کیا قدم اٹھایا جائے۔ بہت غور و خوض کے بعد دو فیصلے ہوئے:

اول: مسلمان بطور احتجاج ۱۳ دسمبر ۱۹۱۹ء کے مجوزہ جشن آزادی میں کوئی حصہ نہ لیں۔
دوم: ایک وفد انگلستان جائے اور حکومت برطانیہ پر ترکیا اور خلافت عثمانی کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات اور خیالات واضح کرے۔

نیز یہ فیصلہ ہوا کہ اگلی کانفرنس اواخر دسمبر (۱۹۱۹ء) میں امرتسر میں آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس کے دنوں میں منعقد کی جائے۔

مجوزہ وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو انگلستان کے لیے روانہ ہوا۔ اس کے دوسرے ارکان مولانا سید سلیمان ندوی، سید حسین (بمبئی کرائیکل) تھے۔ علی گڑھ کے مشہور پرانے طالب علم حن محمد حیات (لارڈ حیات) سکرٹری چنے گئے تھے۔ وفد اکتوبر ۱۹۱۹ء میں بے نیل مرام وطن واپس آیا۔

اس دوران میں مولانا ابوالکلام آزاد یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رانچی کی نظر بندی سے رہا کر دیے گئے۔ وہ دلی پہنچے۔ یہاں اس وقت مجلس خلافت کے عمائد و السراے کی خدمت میں ایک وفد بھیجنے کے مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد سے بھی محضر پر دستخط کرنے اور وفد میں شامل ہونے کے لیے کہا۔ مولانا آزاد نے دستخط تو کر دیے لیکن ولسراے کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اب مسئلہ خلافت میں درخواستیں گزارنے یا محضر پیش کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے کا؛ بلکہ اس کے لیے زیادہ کڑے اقدامات کا وقت آگیا ہے۔ یہ وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو ولسراے کی خدمت میں گیا اور حسب توقع خالی ہاتھ واپس آیا۔ اس موقع کی دو اور اہم باتیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ مولانا آزاد کی گاندھی جی سے اولین ملاقات اسی موقع پر یہیں دلی میں حکیم محمد اجمل خان کے مکان پر ہوئی۔

اس ملاقات کے دوران میں ایک اور اہم واقعہ پیش آیا۔ اس محفل میں گاندھی جی کے علاوہ مولانا عبدالباری (فرنگی محل، لکھنؤ)، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم محمد اجمل خان، ڈاکٹر انصاری بھی موجود تھے۔ تبادلہ خیالات ہو رہا تھا کہ گاندھی جی نے عدم تعاون (نان کو آپریشن)

کی تجویز پیش کی۔ تمام اکابر نے کہا کہ ہمیں اس پر غور کرنے کا موقع دیا جائے، ہم اس کا جواب بعد کو دینگے۔ لیکن مولانا آزاد نے فوراً اسے قبول کر لیا۔ اور کہا کہ مجھے یہ منظور ہے اور یہی صحیح راہ عمل ہے (بعد کو انھوں نے اسے نص قرآنی سے ثابت کیا جو ان کے قرآن پر غور و فکر کی دلیل ہے)

اس کے بعد مجلس خلافت کی تیسری کانفرنس وسط فروری ۱۹۲۰ء میں بمبئی میں ہوئی۔ وہاں پھر عدم تعاون کی تجویز پیش ہوئی۔ لیکن اس پر فیصلہ وفد خلافت کے انگلستان سے واپس آنے تک ملتوی کر دیا گیا۔

خلافت کے عائد ابھی تذبذب میں تھے کہ انھیں دنوں انگلستان کے لاٹ پادری نے اپنی ایک تقریر میں کہہ دیا کہ مسلمانوں سے سات سو برس قبل کی حروبِ سلیبیہ کی شکست کا حساب چکانے کا وقت آگیا ہے۔ قدرتاً اس پر جذبات سخت مشتعل ہو گئے، خاص طور پر اس لیے کہ وزیرِ اعظم انگلستان اپنے اعلان (۲ نومبر ۱۹۱۴ء) میں یقین دہانی کر چکے تھے کہ یہ جنگ مذہبی نہیں ہے۔ یہی انتشار کی حالت تھی کہ اس کے فوراً بعد ۲۸-۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو بنگال پرائونشل خلافت کمیٹی کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس جلسے کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنا خطبہ صدارت لکھا نہیں تھا، بلکہ حاضرین کو برہستہ فی البدیہہ خطاب کیا تھا۔ یہ تقریر اسی وقت ساتھ ساتھ قلمبند کرنی گئی تھی۔ اور ان کی نظر ثانی کے بعد اسی زمانے میں کلکتہ خلافت کمیٹی کی طرف سے "مسئلہ خلافت اور جزیۃ الخ" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

اس مسئلے پر یہ خطبہ سند ہے۔ اس میں خلافت کی دینی، تاریخی، سیاسی حیثیت پر پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اور ہر ایک دعوے پر قرآن و حدیث، ائمہ فقہ اور تاریخ سے استدلال کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد پوری تحریک خلافت کے لیے اس خطبے نے بنیادی آئین کا کام دیا۔ اس میں خاص طور پر یہ مسئلے کھل کر سامنے آ گئے۔

اول: خلافت محض سلطان ترکیا کے خلیفۃ المسلمین ہونے کی بات نہیں ہے، بلکہ یہ سلام کا بنیادی اصول ہے۔ اسے تسلیم کرنا اور کسی خلیفہ کا ہر زمانے میں موجود رہنا اسلام

کے عقائد میں داخل ہے۔

دوم : انہوں نے پھر سورہ ممتحنہ کی محولہ فوق آیات (۸-۹) سے استدلال کیا کہ قرآن نے غیر مسلم دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک فریق وہ ہے جو مسلمانوں کو قتل کرتا ہے، انہیں ان کے گھر بار اور وطن سے باہر نکالتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو نہ صرف یہ کہ ایسا کوئی کام نہیں کرتا، بلکہ ان کی طرف دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ پہلا گروہ انگریزوں کا ہے؛ اور دوسرا ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کا ہے۔ پہلا فریق محارب ہے اور دوسرا دوست۔ پہلے سے کبھی دوستی اور تعاون جائز نہیں۔ اور دوسرے کے ساتھ ہر معاملے میں دوستی اور تعاون فرض ہے؛ بلکہ حضرت شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کی پیروی میں ہم برادران وطن کے ساتھ ایک قوم بننے پر مجبور ہیں۔

سوم : انہوں نے غزوہ تبوک کے زمانے میں کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کے عمل سے یہ استدلال کیا کہ ترک موالات (نان کو آپریشن) اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ اور ہمیں انگریزوں اور حکومت ہند کے خلاف اس پر عمل کرنا چاہیے۔

اس واقعے کی مکمل صورت اور مولانا آزاد کے استدلال اور اس سے اخذ کردہ نتائج کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے^{۱۹}۔

(۵)

۹ھ کا واقعہ ہے کہ خبر ملی کہ رومیوں نے تبوک میں چالیس ہزار کا لشکر جمع کر لیا ہے اور وہ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ بڑی تنگدستی اور بے سرد سامانی کا زمانہ تھا۔ ہر طرف فحط کے سے آثار تھے۔ اس پر شدید گرمی کا موسم تھا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو ہتھیار بندی اور کوچ کا حکم دے دیا کہ پیش قدمی

۱۹۔ بخاری (کتاب المغازی - غزوہ تبوک) میں پوری حدیث خود کعب بن مالک سے مروی موجود ہے۔ وہیں کتاب الاحکام کے آخری باب میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

مور کے تہوگ پہنچ جائیں۔ دفاع اور قوم کے لیے حیات اور موت کا سوال تھا۔ لہذا حکم عام تھا اور کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔

منافقین کے علاوہ صرف تین انصاری اصحاب، کعب بن مالک اور ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع فوج کے ساتھ نہ جاسکے۔ یہ تینوں اصحاب بدری تھے۔ بلکہ کعب بن مالک کا تو سابقون الاولون میں شمار ہے، وہ عقبہ کی بیعت ثانیہ کے ۳، اصحاب میں شامل تھے۔ کعب کہتے ہیں کہ میں کسی بدعتی کے باعث نہیں، بلکہ سہل انگاری اور کاہلی کے سبب نہ جاسکا۔ میں نے پورا سامان ہتیا کر لیا تھا۔ لیکن آج کل کرتا رہا، تا آن کہ وقت نکل گیا۔ فوج بہت دور نکل گئی، اور میں ان سے مل نہ سکا۔

اسلامی فوج کے اس مستعدی اور قوت کے ساتھ بکھرنے کی خبر سنتے ہی رومیوں کی ہمت جواب دے گئی، اور وہ منتشر ہو گئے۔ لہذا جب آنحضرت صلعم تہوگ پہنچے، تو میدان صاف تھا۔ آپ نے وہاں تین چار ہفتے قیام کیا اور اس کے بعد مدینہ واپس چلے آئے۔

مدینہ پہنچے، تو تینوں اصحاب جو ساتھ نہیں جاسکے تھے، حاضر خدمت ہوئے۔ عذر پیش کیا اور معافی کے طلبگار ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جرم ایسا نہیں کہ یوں آسانی سے معاف کر دیا جائے۔ جاؤ، گھر میں بیٹھو اور فیصلہ وحی کا انتظار کرو۔ تمام مسلمانوں کو حکم ہوا کہ ان سے قطع تعلق کر لیں۔ کوئی ان سے ملے، نہ بات چیت کرے، نہ واسطہ رکھے۔ یہاں تک کہ ان کی بولیوں کو بھی ان سے تعلقات منقطع کر لینے کی ہدایت کر دی گئی۔

یہ مقاطعہ ۵۰ دن تک جاری رہا۔ ان غریبوں نے یہ زمانہ جس طرح سے آہ و زاری اور نابت الی اللہ میں کاٹا، اس کا حال بخاری کی حوالہ فوق تفصیلی حدیث میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بالآخر آیت نازل ہوئی:

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَفُوا
حَتَّىٰ إِذَا صَاحَتْ عَلَيْهِمْ

اور اسی طرح ان تین شخصوں پر کہیں اس کی نابت
لوٹ آئی، جو اعلیٰ حالت میں (چھوڑے گئے تھے)

الْأَرْضُ بِمَا سَحَبَتْ وَ
ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ
وَوَدَّوْنَ أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ
إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ
لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ

(اور اس وقت لوٹ آئی) جب کہ زمین اپنی ساری
وسعت پر بھی ان کے لیے تنگ ہو گئی تھی۔ اور وہ خود
بھی اپنی جان سے تنگ آ گئے تھے۔ اور انہوں نے
جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انھیں کوئی پناہ نہیں
مل سکتی، مگر خود اسی کے دامن میں۔ پس، اللہ (اپنی
رحمت سے) ان پر لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں۔ بلاشبہ
اللہ ہی ہے بڑا توبہ قبول کرنے والا، بڑا ہی رحمت والا۔

اس کے بعد ان تینوں کو معافی مل گئی اور حالات معمول پر آ گئے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے :

حضرت ابو ایوبؓ انصاری سے ایک حدیث مروی ہے (اور دوسرے صحابہ سے بھی) کہ حضرت
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مومن (مسلم) کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین
دن سے زیادہ خفا ہو کر کسی مسلمان کو چھوڑ دے (متفق علیہ)۔ اور یہاں ان تینوں حضرات
سے پوری قوم ۵۰ دن تک خود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بے تعلق اور خفا رہی۔ اس
سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا قوم کے دفاع میں حصہ نہ لینا، اور اس طرح بالواسطہ دشمن
کی اعانت کرنا، کتنا بڑا جرم خیال کیا گیا۔ مولانا آزاد اس واقعے سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ
جب ان جلیل القدر صحابہ کو ملک کے دفاع میں کسی بدعتی سے نہیں بلکہ غفلت اور تساہل
کے باعث حصہ نہ لینے پر اتنی سخت سزا ملی، تو ہمارا ان لوگوں سے کیا سلوک ہونا چاہیے، جو
عہدِ خلافت کے سلسلے میں، انگریزوں سے تعاون کر رہے ہیں، جو ہمارے دین و دنیا کے
دشمن ہیں!

اس کے بعد وہ دو فیصلے سناتے ہیں:

(۱) صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطین عثمانیہ کو حاصل ہے۔

..... پس ان کی اطاعت و اعانت تمام مسلمانوں کا دینی فرض ہے۔ جو ان کی

اطاعت سے باہر ہوا، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا... جس نے ان کے مقابلے میں لڑائی کی، یا ان کے دشمنوں کا ساتھ دیا اس نے خدا اور اس کے رسول سے لڑائی کی۔

(۲) صرف خلیفہ اسلام ہی کے لیے یہ حکم مخصوص نہیں ہے۔ جب کبھی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں لڑائی ہو، تو کسی مسلمان کے لیے شرعاً جائز نہیں کہ وہ غیر مسلمان فوج کا ساتھی ہو کر مسلمانوں سے لڑے، یا ان کی مدد کرے۔

اگر کریگا تو حکم من حمل علینا السلاح فلیس منا اور نص قرآنی من یقتل مؤمناً متعمداً فجزأؤہ جحیم خالد اذینھا

وہ اسلامی جماعت سے خارج ہو جائیگا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

اس کے بعد ۲۳ مارچ ۱۹۲۰ء کو خلافت کا نفرنس میرٹھ میں ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اس کلکتے کے خطے کے بعد یہ پہلی آل انڈیا خلافت کانفرنس تھی۔ مہاتما گاندھی نے جو اس جلسے میں بھی موجود تھے، پہلی مرتبہ باقاعدہ رسمی طور پر اپنی عدم تعاون کی تجویز پیش کی جو منظور ہوئی۔ اس کی رو سے ملک سے مطالبہ کیا گیا کہ

(۱) تمام سرکاری خطابات اور اعزازات حکومت کو واپس کر دیے جائیں۔

(۲) سپاہی فوج اور پولیس کی ملازمت سے مستعفی ہو جائیں۔

(۳) سرکاری ٹیکس اور دوسری واجب الادا رقوم کی ادائیگی سے انکار کر دیا جائے۔

اسی کے ساتھ اسکیم کی کامیابی کے لیے انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر خاص زور دیا۔ ہنوز ترکیا سے جوڑہ تسلیماتے پر دستخط نہیں ہوئے تھے۔ لیکن بین خلافت عثمانی کے بارے میں بڑی دشتناک خبریں گشت لگا رہی تھیں۔ ایک حلقے کو توقع تھی کہ شاید حکومت برطانیہ اپنا

۲۲۔ متفق علیہ۔ بخاری۔ کتاب الفتن (۶: ۲۰۶)۔ (اصح المطابع، دہلی) یہ حدیث متعدد دوسرے

مجموعوں میں بھی موجود ہے۔

۲۳۔ النساء، ۴: ۹۳

اثر و رسوخ استعمال کر کے صلح کی شرائط میں کچھ نرمی کرا سکے۔ چنانچہ اس کے بعد (۱-۲-۳۰) ۱۹۲۰ء کو خلافت کا جو اجلاس الہ آباد میں ہوا، اس میں باتفاق رائے یہ تجویز منظور ہوئی کہ ایک وفد السراے سے مل کر انھیں خلافت کے مسئلے میں مداخلت پر آمادہ کرے انھیں یہ بتا دیا جائے کہ اگر یکم اگست ۱۹۲۰ء تک حکومتِ برطانیہ شرائطِ صلح میں مناسب تبدیلی کرانے میں کامیاب نہ ہوئی، تو اس کے بعد ہندستان کے مسلمان ترکِ موالات مجبور ہو جائیں گے۔

یکم اگست آیا، اور گزر گیا۔ نہ السراے کچھ کر سکے، نہ حکومتِ برطانیہ نے معاہدہ سیوے کسی نرمی کے لیے کوئی سلسلہ جنبانی کی۔ ۱۵ اگست ۱۹۲۰ء کو صلح نامہ مکمل ہو گیا اور اس ترکیا کی طرف سے توفیق پاشا نے کانپتے ہاتھوں سے دستخط کر دیے۔

اس کے بعد ترکِ موالات کی تحریک کے دوران میں جو کچھ ہوا، ملک نے اس میں جو عظیم قربانیاں دیں، اور حکومت نے اس تحریک کے دبانے کے لیے جس سختی اور تشدد سے کام لیا، یہ سب کچھ تاریخِ ہند کا حصہ ہے، اور ہمارے موضوع سے خارج۔ لیکن یہاں دو باتیں قابلِ ملاحظہ ہیں۔ پہلی یہ کہ "ترکِ موالات" کی اصطلاح مولانا آزاد کی وضع کی ہوئی تھی۔ دوسری بات ترکِ موالات کی تحریک دراصل خلافت کی تحریک تھی۔ شروع میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، کانگریس نے اسے بعد کو اپنایا۔

(۶)

۶ تا ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کو لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں انڈین نیشنل کانگریس کا اسپیشل اجلاس کلکتے میں ہوا۔ اس کے ایجنڈا میں خاص طور پر کانگریس اور تحریکِ خلافت کے باہمی تعلقات ترکِ موالات پر غور کرنا شامل تھا۔ خلافت کا اجلاس بھی اسی زمانے میں وہاں مولانا کی صدارت میں ہوا تھا۔ ترکِ موالات کے مسئلے پر طویل اور گرم بحث ہوئی۔ دراصل بعض لیڈر اس کے خلاف تھے۔ بہر حال کانگریس نے ترکِ موالات کی تحریک (۱۸۸۶ء) میں (۸۸۲ء) اور خلافت سے مکمل تعاون کی تجویز منظور کرنی۔ اور مہاتما گاندھی کانگریس

رہنما تسلیم کر لیے گئے۔^{۲۴}

اس کے بعد جب معمول کانگریس کا سالانہ اجلاس ۲۶ دسمبر ۱۹۲۰ء سے شری وجے راگھو چاریار کی صدارت میں ناگپور میں ہوا۔ اس میں ترک موالات کی کلکتہ والی قرارداد کی تصدیق کر دی گئی۔ کانگریس نے خلافت کا نفرس، میرٹھ میں منظور کردہ سہ گانہ تحریک میں کمی اور مدت کا اضافہ کر کے اس کا دائرہ عمل بہت وسیع کر دیا۔ اب اس کی یہ شکل ہو گئی۔^{۲۵}

(۱) حکومت ہند اور حکومت برطانیہ نے خلافت کے معاملے میں اپنے وعدوں کا کوئی پاس نہیں کیا، اور خلافت کے بارے میں مسلمانوں کے ساتھ سخت نا انصافی ہوئی ہے۔

(۲) پنجاب کے مظالم کے سلسلے میں بھی مجرموں سے کوئی باز پرس نہ کر کے حکومت نے ظالمانہ اور غیر منصفانہ رویے کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا واحد علاج سوراخ ہے جس کے حصول کے لیے ہم مصمم عہد کرتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لیے ہم فی الحال ہاتھ مارتا گانہ صی کے مجوزہ مندرجہ ذیل بتدریج عدم متشددانہ ترک موالات پروگرام کی تائید کرتے ہیں:

(الف) تمام سرکاری خطابات اور اعزازات واپس کر دیے جائیں اور تمام مقامی اداروں کے نامزد اراکین استعفیٰ دے دیں۔

(ب) تمام درباروں اور تقریبوں اور حکومت کی طرف سے منعقدہ سرکاری اور نیم سرکاری جلسوں میں حاضری سے انکار کر دیا جائے۔

(ج) سرکاری، سرکار سے امداد پانے والے، یا سرکار کے انتظام میں چلنے والے تمام اسکولوں اور کالجوں سے طلبہ بتدریج نکل آئیں (اور ان کی بگڑ تمام صوبوں میں آزاد قومی درس گاہیں قائم کی جائیں)

۲۴۔ انڈین نیشنل کانگریس، انگریزی از پتا بھی سیتا رامیا، ۱: ۲۰۲ - ۲۰۳ (نئی دہلی: ۱۹۰۵ء)

۲۵۔ ایضاً، ۱: ۲۰۳

(۵) تمام وکلاء اور مقدمے دائر کرنے والے حضرات بتدریج حکومت کی قائم کردہ عدالتوں کا بائیکاٹ کریں۔

(۶) فوج کے سپاہی اور انتظامی عملہ اور کارکن عراق میں ملازمت کے لیے جانے پر ہرگز تیار نہ ہوں۔

(۷) کونسلوں کے انتخاب کے تمام امیدوار اپنی درخواستیں واپس لے لیں۔ اور اگر کانگریس کی اس ہدایت کے باوجود کوئی امیدوار کھڑا ہو جائے تو اسے ووٹ نہ دیا جائے۔

(۸) تمام بدیشی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ (اس کے لیے چرغہ کاٹنے اور کھادی کے استعمال کی خاص سفارش کی گئی)

(۷)

آل انڈیا مجلسِ خلافت کی سالانہ کانفرنس ۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کراچی میں منعقد ہوئی۔ مولانا محمد علی اجلاس کے صدر تھے۔ یہ تحریکِ خلافت کے شباب کا زمانہ تھا۔ انگریزوں اور اتحادی طاقتوں نے ترکیا کے ساتھ صلحنامے کی جن شرائط کا اعلان کیا تھا، ان سے ترکیا کی آزاد حیثیت بالکل ختم ہو جاتی تھی؛ اور عثمانی خلافت کا صدیوں کا بنا ہوا پورا شیرازہ بکھر جاتا تھا۔ اس سے لوگوں کے جذبات بہت مشتعل تھے۔ لازماً کانفرنس میں سخت جوش و خروش تھا، اور لوگ کچھ مثبت تجاویز سننے اور عملی اقدام کی توقع لے کر جمع ہوئے تھے۔

اس کانفرنس کی سب سے اہم قرارداد یہ تھی کہ انگریزی فوج کی نوکری حرام ہے؛ مسلمانوں کو اس سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ اس پر دلیل یہ دی گئی کہ جنگ میں مسلمان فوجیوں کو مسلمانوں سے لڑنا پڑتا ہے، اور یوں مسلمان، مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہوتا ہے جو قرآن کے صریح حکم کے خلاف ہے، جس کی سزا جہنم بیان کی گئی ہے۔ پس یہ کسی طرح جائز نہیں کہ مسلمان فوج میں بھرتی ہوں۔

یہ تجویز صاحب صدر، مولانا محمد علی نے خود پیش کی۔ اور اس کی تائید کے بعد دیگرے مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد دنی، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدد، جگت گورو وینکٹ رامن شنکر اچاریہ (شاردا پیٹھ) نے پُر زور اور جوشیلی تقریروں میں کی، اور قرارداد با تفاق اسے منظور ہو گئی۔

جلسہ ختم ہو گیا اور سب لوگ اپنے اپنے مقام پر چلے گئے۔ لیکن حکومت غافل نہیں تھی۔ سب سے پہلے مولانا محمد علی کو والٹیر کے ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا۔ اور پھر ایک کے بعد ایک تمام حضرات جنہوں نے تجویز کی تائید میں تقریریں کی تھیں پکڑ لیے گئے۔ ان کے علاوہ دلی میں مولانا احمد سعید اور عبدالعزیز وغیرہ بھی گرفتار کر لیے گئے۔ الزام یہ تھا کہ اس قرارداد کی غرض ملک معظّم کی فوج میں بغاوت پھیلانا اور تشدد کی ترغیب دینا ہے۔ مقدمہ چلا۔ عدالت نے شنکر اچاریہ کے سوا سب حضرات کو دو دو برس قید کی سزا دے دی۔

اس کے کوئی مہینا بھر بعد یوپی پرائشل مجلس خلافت کا سالانہ اجلاس (۲۵-۲۶ اکتوبر ۱۹۲۱ء) آگرہ میں ہوا۔ مولانا آزاد صدر تھے۔ انہوں نے اجلاس کے دوسرے دن (۲۶ اکتوبر) اس مقدمے پر تفصیلی تقریر کی اور بتایا کہ فوج میں مسلمانوں کی بھرتی کی قراردادیں تو ڈیڑھ دو برس سے ملک بھر کے تمام جلسوں میں منظور ہوتی آرہی ہیں۔ خود میں نے بارہا اس کا اعلان کیا ہے۔ اور یہ فیصلہ میرا نہیں، بلکہ قرآن کا حکم ہے۔ انہوں نے پھر سورہ ممتحنہ کی حوالہ فوق آیات (۸-۹) کا حوالہ دیا، ان کی تفسیر کی اور بتایا کہ انگریزی حکومت، اس نص قرآنی کی رو سے اُس گروہ میں شامل ہے، جس سے تعادد اور موالات اور دوستی جائز نہیں۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ برٹش گورنمنٹ کی فوج میں نوکری کرے یا نوکر رکھائے۔ انہوں نے اسلام کی تعلیم ان لفظوں میں بیان کی:

اسلام نے اور اسلام کے قانون نے اس نوکری کو، اس کام کو، جس میں انسان کا خون بہانا پڑے، ایک ایسا گناہ قرار دیا ہے، جس کے لیے رسول کی زبان

۲۷. خطبات آزاد، ۱: ۷۳

۲۸. ایضاً، ۱: ۷۹

پر کفر کا لفظ جاری ہوا ہے۔ اسلام کے قانون نے مسلمانوں ہی کا قتل نہیں بلکہ کسی انسان کا بھی قتل کرنا اور اُس کا خون بہانا ایک بہت بڑی معصیت گناہ پاپ قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورہ فرقان میں فرمایا ہے: وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ^{۲۹} یعنی وہ لوگ جو خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے، کسی جان کو قتل نہیں کرتے، جسے اللہ نے روک دیا ہے، اور جسے اللہ نے حرام کر دیا۔ لیکن اگر انہیں کرنا پڑتا ہے، تو صرف ان جانوں کے لیے وہ قتال جائز رکھتے ہیں، جن جانوں کو اللہ کی عدالت کے قائم رکھنے کے لیے سزا دینا ضروری ہے۔

انہوں نے اس تقریر میں یاد دلایا کہ میں نے ۱۹۱۶ء میں جب میں رانچی میں نظر بند تھا، حکومت کو ایک چھٹی لکھی تھی، جس میں "نہایت تفصیل سے اسلام کے احکام درج کر دیے تھے، جن کی سے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی برٹش گورنمنٹ کی نوکری کرے۔" پھر تضحی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہاں، ہاں، میں نے سپاہیوں سے، ہندستان کی برٹش فوج سے، یہ کہا ہے، اور جب تک میرے صلق میں آواز پھنستی نہیں، یہی کہتا رہوں گا۔ آج بھی اعلان کرتا ہوں، اور جب تک میری زندگی باقی ہے، ہر صبح کو، ہر شام کو، میرا پہلا فرض یہی ہوگا کہ سپاہیوں کو درغلاؤں، اور ان سے کہوں کہ گورنمنٹ کی نوکری چھوڑ دو۔ کیا عظیم الشان برٹش گورنمنٹ جس کی حکومت میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا، تیار ہے کہ (مجھے) گرفتار کرے! اگر یہ جرم ہے تو اس جرم کا ارتکاب تمام ملک کر رہا ہے۔ میں نے سپاہیوں سے بھی کہا ہے، اور لوگوں

۲۹۔ سورہ فرقان، ۲۵: ۶۹

۳۰۔ خطبات آزاد، ۱: ۶۲

۳۱۔ ایضاً، ۱: ۶۲

سے بھی کہا ہے کہ تم سپاہیوں کے پاس چھاؤنیوں میں جاؤ اور سپاہیوں کو
یہ پیغام سناؤ۔ پھر برٹش گورنمنٹ اگر اپنی طاقت کا گھنٹہ رکھتی ہے، تو کیوں
نہیں قدم آگے بڑھاتی! کیا گورنمنٹ کی مشینری پر فالج گر گیا ہے!
حکومت نے یہ چیلنج قبول نہیں کیا تھا۔

(۸)

جب مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں الہلال جاری کیا ہے، تو علی گڑھ اسکول کے زیر اثر
مسلمانوں کے سوادِ عظیم کے نزدیک سیاستِ ملکی میں دلچسپی یا داخلہ، شجر ممنوعہ سے کم نہیں تھا۔ چونکہ
سر سید کی تعلیمی پالیسی کسی حد تک کامیاب رہی تھی، اس لیے یہ سمجھ لیا گیا کہ انہوں نے سیاست
سے متعلق جو کچھ کہا تھا، وہ بھی درست ہوگا۔ انگریزی حکومت نے بھی تعلیم یافتہ مسلمانوں کو فرائض
سے سرکاری نوکریوں میں لے کر ان کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس لیے بھی یہ خیال پختہ ہو گیا کہ
سر سید کی دکھائی راہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اور کسی کو اس ہمرنگ زمیں جال کی تہ تک دیکھنے
کی توفیق نہ ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی نے آج تک اس کے خلاف چلنے یا اس پر تنقید کرنے کی
جرات نہیں کی تھی۔

جادو کے اس حصار کو پہلی مرتبہ مولانا آزاد اور الہلال نے توڑا، اور اس کے خلاف آواز بھی
اٹھائی تو قرآن اور حدیث کی بنا پر مسلمان اس آواز کے سننے پر مجبور تھے کیونکہ سر سید کے مقابلے
میں یہ خدا اور رسول کی آواز تھی۔ اسی لیے اس کی کامیابی بھی یقینی تھی۔

یہی پہلی عالمی جنگ کا بھی زمانہ ہے۔ اس کی مناسبت سے مولانا آزاد نے جہاد کا تصور پھونکا۔
یہ سر سید کی تعلیم پر دوسری کاری ضرب تھی۔ وہی مسلمان جو سر سید کی تحریروں سے متاثر ہو کر
اس حکمِ خداوندی کو فراموش کر چکے تھے، یکایک خوابِ غفلت سے چونک اٹھے، اور انہیں محسوس
ہوا کہ ہم آج تک ایک ضروری فرض کی ادائیگی میں قصور وار رہے ہیں۔
اب نہ صرف مسلمانوں نے ملکی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا، بلکہ ترکیا کے خلاف انگریزی

سیاست اور جوڑ توڑ نے گویا جلتی پرتیل کا کام کیا۔ ملک میں تحریکِ خلافت کا غلغلہ بلند ہوا تو ہندوؤں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے مسلمان بھائیوں کی ہر طرح سے مدد کی۔ مولانا آزاد نے قرآن اور سنتِ رسول سے ثابت کیا کہ چونکہ انگریز ہر میدان میں مسلمانوں کے حقوق پامال کر رہے ہیں، مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں، انہیں ان کے گھر بار اور وطن سے نکال رہے ہیں، لہذا وہ فریقِ محارب ہیں، ان سے کسی صورت تعاون جائز نہیں، یہ حکمِ قرآنی کے خلاف ہے۔ ان کے مقابلے میں ہندو برادرانِ وطن اپنے قول و فعل سے ہمارے ساتھ دوستی اور تعاون کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ پس ہمیں انگریزوں سے ترکِ موالات کرنا اور ہندوؤں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہیے۔

آپ دیکھینگے کہ ان سب مسائل میں مولانا آزاد کا استدلال قرآن اور حدیث سے تھا۔ وہ قرآن کے بارے میں لکھتے ہیں:

کامل تئیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں۔ تفسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے۔ اور علومِ قرآن کے مباحث و مقامات کا کوئی گوشہ نہیں، جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجوئے تساہل کیا ہو۔ علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں۔ لیکن میرے لیے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے، وہ مجھے درشتے میں ملا، اور جو کچھ جدید ہے، اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکال لیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی

۳۲- ترجمان القرآن، ۱: ۵۱-۵۲ (سہ ماہیہ اکادمی ایڈیشن)

بھالی ہیں، جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں۔

رہا ہوں زند بھی میں، اور پارسا بھی میں
مری نظر میں ہیں زنداں و پارسا اک ایک

خاندان، تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا، میں نے اول روز ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کر دیا، اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں بھی روک نہ ہو سکیں، اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔

اسی طویل مطالعے اور غور و فکر اور تدبیر کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے جو فیصلہ کیا، وہ اتنا صحیح اور پایدار تھا کہ انہیں کبھی اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اور یہ ہے بھی سچ بات۔ خدائی فیصلے اٹل ہوتے ہیں، انہیں تبدیل کرنے کی کبھی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۶۲:۳۳)۔ اور جو نتیجے آپ خدائی احکام اور فیصلوں پر مبنی کریں گے، وہ بھی اٹل اور غیر متبدل ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ عمر بھر مولانا آزاد کا فیصلہ اور عمل ایک ہی رہا۔ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں جس راہ پر قدم رکھا تھا، ۱۹۵۸ء میں اپنی وفات تک، اس سے سرنوا انحراف نہیں کیا۔ اس سفر حیات میں انہیں اپنوں سے، اور غیروں سے، کیا کچھ نہیں سننا پڑا، کیا کچھ نہیں سہنا پڑا، ایسے ن کے پاس استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے لیے یہ راہ قرآن پر تدبیر و تفکر کے بعد انتخاب کی تھی؛ سنتِ رسول کے مطالعے کے بعد اختیار کی تھی۔ جب تک یہ دونوں ماخذ تبدیل نہ ہو جائیں، اور اس کے نتیجے میں ان سے اخذ کردہ نتائج غلط نہ ثابت ہو جائیں، وہ کیونکر اپنی مقرر کردہ راہ ترک کر سکتے تھے!

جاننے والے جانتے ہیں کہ پوری تحریکِ خلافت کا آئین و دستور ان کا جذبہ کلکتہ تھا، جو اسی زمانے میں کتابی شکل میں شائع ہو گیا تھا۔ اور یہی تحریکِ ہندو مسلم اتحاد کی ابتدا اور مسلمانوں کے ملکی سیاست میں جوق در جوق شامل ہونے کا باعث ثابت ہوئی۔

مسلمانوں کو ملکی سیاست میں شامل کرنے کے لیے لابد تھا کہ انھیں ترغیب دلانے کے لیے مذہبی بنیاد قائم کی جائے۔ یہ بنیاد مولانا آزاد نے اپنے عمر بھر کے قرآنی اور اسلامی مطالعے اور غور و فکر کے نتائج کی شکل میں پیش کی۔ کوئی اسے تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن یہ ہے واقعہ کہ مولانا آزاد اس پوری تحریک کے فلاسفر اور اصول ساز تھے۔ اور بیشتر دوسرے مسلم رہنما اس کے دست و بازو اور نافرمانی کرنے والے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ

غالب اور ابوالکلام آزاد

غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں کی زندگی میں کئی لحاظ سے بہت مماثلت ہے۔ اور باوجود کہ ان کی سرگرمیوں کے میدان ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے، ان کے کردار کا یہ اشتراک صرف دلچسپ ہی نہیں، بلکہ ان دونوں کا روزگار (GENIUS) شخصیتوں کے نفسیاتی مطالعے کی بنیاد بھی بن سکتا ہے۔

مثلاً پہلی بات یہی لیجئے کہ دونوں پیدائشی باغی تھے۔ دونوں نے آبائی عقائد سے بغاوت کی۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے غالب کے دوھیال اور ناھیال — دونوں خاندانوں کے عقائد اہل سنت کے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ غالب نے بھی ایک مرتبہ مسخر میں کہا تھا: شیعہ کیونکر ہو ماوراء النہری، واقعی اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وسط ایشیا کے جس خطے سے ان کے دادا میرزا اوقتان بیگ خان، اٹھارویں صدی کے وسط میں ہجرت کر کے ہندستان آئے تھے، وہ سنی عقائد کا گویا گریٹھ تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہاں کے باشندے اپنے عقائدات میں بہت کڑے تھے۔ ان کی یہ خصوصیت ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکی تھی اور اسی کی طرف غالب نے اپنے اس مصرعے میں اشارہ کیا ہے۔ لہذا یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ غالب کے دادا میرزا اوقتان بیگ خان اور خاندان کے دوسرے افراد بھی اسی عقیدے کے پیرو تھے۔

ایک اور بات۔ قرآن سے استنباط کیا جاسکتا ہے کہ لوہارو کے اور غالب کے خاندانوں میں اگر پہلے سے رشتہ داری نہیں تو بہت قریبی تعلقات ضرور تھے۔ ورنہ اس زمانے میں جب کہ

کفو اور غیر کفو کا سوال اتنا اہم تھا، نواب احمد بخش خان (والی لوہارو) کی ہمشیر کا عقد نکاح غالب کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خان سے ممکن نہیں تھا۔ بعد کو خود غالب کا نکاح نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی الہی بخش خان معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہونا بھی اسی امر کی مزید دلیل اور ثبوت ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں پہلے سے گہرا ربط ضبط تھا۔ خاندان لوہارو کا اہل تسنن ہی سے نہیں، بلکہ مشہور صوفی بزرگ خواجہ احمد یوسف کی اولاد میں ہونا سب کے علم میں ہے۔ پس یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ غالب کے اجداد اہل سنت کے عقیدے کے پیرو اور پابند تھے۔

غالب کے معاصر تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے خاندان کا سنتی ہونا بیان کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کہتے ہیں:

میرزا کے تمام خاندان کا اور بزرگوں کا مذہب سنت و جماعت تھا۔
تمام اقربا اور حقیقی دوست سنت و جماعت تھے۔

مولانا حالی ان کے سوانح نگار ہیں۔ غالب کی سب سے پہلی سوانح عمری "یادگار غالب" حالی ہی کی تصنیف ہے۔ وہ بھی اس کی تائید کرتے اور لکھتے ہیں:

جہاں تک ہم کو معلوم ہے۔ مرزا کے والد سنتی المذہب تھے:

خود میرزا نے بھی اس کا اقرار کیا ہے۔

ان کی مافی پریشانیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ناسخ نے غالب کو مشورہ دیا کہ آپ حیدرآباد (دکن) چلے جائیں۔ وہاں ان دنوں مہاراجا چندو مال شاہاں کا سا اہل کمال کا قدر داں اور صاحب دل شخص مدار المہام ہے۔ اس کی ادنیٰ توجہ سے آپ کی تمام پریشانیاں رفع ہو جائیں گی۔ غالب نے جواب میں لکھا کہ تیس برس تو رنگ و بو کی سیر اور نئے نئے کی صحبت میں

۱- آب حیات : ۵۱۳-۵۱۴ (مطبع کرمی، لاہور۔ بار دوم)

۲- یادگار غالب : ۲۱۵ (مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

۳- متفرقات غالب : از سید مسعود حسن رضوی : ۱۰۱- (ہندستان پریس : رام پور۔ ۱۹۴۷ء)

بسر ہو گئے۔ اب دل ان چیزوں سے بھر گیا ہے۔ اب تو یہ خواہش رہ گئی ہے کہ اگر موقع ملے تو، ایک مرتبہ ایران جاؤں اور شیراز کے آشکدوں کو دیکھوں اور اگر پاٹو میں چسپنے کی طاقت باقی رہے تو

فرجام کار بہ نجف اشرف برسم و مزار آل را کہ از کیش آباہم
 بدر آورد و بخود بخود کشید، بنگرم؛ متاں جان دہم و سر بباہین
 فنا نہم۔

یہاں الفاظ "از کیش آباہم بدر آورد و بخود بخود کشید" بہت اہم اور غور طلب ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ اہل سنت والجماعت گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور بعد کو شیعیان علی میں شامل ہو گئے اور یہ تبدیلی معلوم ہوتا ہے۔ ابتدا سے عمر ہی میں ہو گئی تھی۔ مثنوی "ابر گہر بار" میں کہتے ہیں:

بود گرچہ باہر کسم سینہ صاف
 من و ایزد، البتہ نبود گزان
 کہ تا کینہ از مہر بشنا ختم
 بکس غیر حیدر نیپر و ان ختم
 جوانی بریں در بسر کردہ ام
 شبی در خیالش سحر کردہ ام
 کنونم کہ وقت گزشتن رسید
 زمان بحق باز گشتن رسید

چسہ کا ہر ز نیروی گرداں سپہر
 چسہ کم گردد از خوبی ماہ و مہر

کہ دل خستہ دہوی مسکنے

ز خاکِ نجف باشدش مدفنے

یعنی میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور کینہ اور محبت میں امتیاز کرنا سیکھا۔ اسی دن سے حضرت علیؑ کے سوا کسی دوسرے سے سروکار نہیں رکھا۔ میری جوانی بھی اسی کے دروازے پر بسر ہوئی اور میری راتیں بھی اسی کی یاد میں گزریں۔ اب کہ وقت اخیر قریب آگیا ہے، کاشیکے مدفن بھی نجف میں نصیب ہو جاتا۔

ایسا خیال گزرتا ہے کہ ان کے تبدیلی عقیدہ پر گھر میں کچھ لے دے ہوئی تھی اور بزرگوں نے ان سے باز پرس کی تھی۔ اُن کا یہ شعر آپ بیتی کا رنگ لے لے ہوئے ہے:

بامن میاویز، لے پدر! فرزندِ آزر رانگر

ہر کس کہ شد صبا نظر، دین بزرگاں خوش نکر

اگر یہ خیال صحیح ہو، تو یہاں پدر سے ان کے نانا خواجہ غلام حسین خان کمیدان مراد ہو سکتے ہیں کیوں کہ اُن کے والد کا تو اُن کی کم سنی میں انتقال ہو گیا تھا؛ اس وقت یہ بمشکل دو برس کے ہونگے۔

ہمیں اس کی تفتیش کرنے کی ضرورت نہیں کہ انھوں نے ”دین بزرگاں“ ترک کر کے ”یہ نیا دین“ کیوں اختیار کیا! ہمارے لیے صرف یہ حقیقت قابلِ غور ہے کہ انھوں نے ”دین بزرگاں“ سے بغاوت کر کے اپنی راہ آپ نکالی تھی۔

ان کی یہ بغاوت کی خصوصیت محض مذہبی عقائد ہی تک محدود نہیں رہی۔ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، تو اس میں بھی روش عام کو چھوڑ کر نئے رستے پر چل نکلے۔ اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس کے اعادے یا کسی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مختصراً یہ کہ اردو شاعری خاص کر غزل میں، ولی اور محمد قلی قطب شاہ سے لے کر ان کے اپنے زمانے تک کے جملہ شعرا جس ڈگر پر چلے جا رہے تھے، غالب نے اول روز ہی اسے یکسر چھوڑ دیا اور اپنے لیے نئی راہ ایجاد کی۔ اس جدت یا بدعت کے لیے، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، انھیں اپنے وقت کے بڑے بڑے مجتہدوں اور استادوں اور ان کی امت سے کیا کچھ نہیں سنبھانا پڑا۔

لیکن انہوں نے جو فیصلہ پہلے دن کر لیا تھا، اس پر جس پامردی اور استقلال اور صلہ و
تائیش سے بے نیاز رہ کر وہ ڈٹے رہے، وہ بھی ہم سب کے علم میں ہے۔ زمانے نے کہ سب
سے بڑا قاضی ہے، فیصلہ کر دیا کہ وہ راہِ راست پر تھے، اور ان کے مخالفین و معتبرین
غلطی پر۔

مولانا ابوالکلام آزاد جس گھرانے میں پیدا ہوئے، وہ پشتوں سے دینی درس و تدریس اور رشد و
ہدایت کا مرکز چلا آ رہا تھا۔ اُن کے والد مولانا خیر الدین تو باقاعدہ پیری مریدی کے طریقے پر
عمل پیرا تھے۔ بمبئی اور کلکتہ کے علاقے میں اُن کے مریدوں کی خاصی بڑی تعداد تھی۔ معتقدات
کے لحاظ سے وہ اتنے سخت قدامت پرست اور بے لچک تھے کہ پرانے مفسرین اور علماء نے
جو تحریری سرمایہ چھوڑا ہے، وہ اس سے سب موانع بھی کفر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ خود ان
کے زمانے میں جزیرۃ العرب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اور ہندستان میں سر سید احمد خان
نے نئی نئی باتیں کہنا اور اسلام کی نئی تفسیر اور تعبیر کرنا شروع کر دی۔ مولانا خیر الدین کے
نزدیک یہ دونوں کافر اور ان کی تائید کرنے والے اور ماننے والے اکفر سے کم نہیں تھے۔ آپ
تعجب کریں گے کہ ان کے خیال میں ملک بھر میں صحیح معنوں میں صرف ڈھالی مسلمان تھے۔ ایک وہ
خود دوسرے مولوی فضل رسول بدایونی اور آدھے مولانا احمد رضا خان۔

مولانا ابوالکلام آزاد انہیں مولانا خیر الدین کے چھوٹے بیٹے تھے۔ انہوں نے تعلیم سراسر خود والد
سے یا ان کے منتخب کردہ اساتذہ سے حاصل کی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کس
بچ پر رہی ہوگی، بالخصوص جب کہ ان سے توقع کی جا رہی تھی کہ وہ اپنے والد کے بعد ان کے
مریدوں کی تربیت اور رہنمائی اور ہدایت کا کام جاری رکھیں گے۔ غرض کہ اُن کے ماحول و تعلیم
کا سارا نظم و نسق ایسا تھا کہ اس میں نئی روشنی کا تو کیا ذکر، پرانی تعلیم کا بھی نہ تھی وہ حصہ
سامنے آیا، جو قدامت پرستی کی آخری حد پر تھا۔

لیکن کیا مولانا ابوالکلام آزاد اس پر قانع ہو گئے تھے یا کیا انہوں نے اپنے والد کی تعلیم کو جاری
رکھا؟ حاشا! ان کی باغی فطرت اس پر مطمئن نہ رہ سکی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میری یہی دس گیارہ

برس کی عمر تھی کہ مجھے اپنے ارد گرد کے حالات سے وحشت محسوس ہونے لگی تھی۔ والد کے مریدوں کا آنا اور میرے ہاتھ پاؤں چومنا، دوزانو ہو کر مہربان میرے سامنے بیٹھنا اور مجھ سے کچھ پسند و نصائح کی توقع کرنا — یہ سب میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔ یہ لے بڑھ کر رفتہ رفتہ اُن عقائد تک پہنچ گئی جن کا صبح سے شام تک گھر میں چرچا رہتا تھا۔ جب میں نے اپنے طور پر مختلف مکاتب فکر و خیال کی کتابیں پڑھیں، تو والد کے بتائے ہوئے عقائد پر میرا ایمان متزلزل ہو گیا اور جن اصحاب کو وہ کافر گردانتے تھے، مجھے پہلے ان سے ہمدردی اور بعد کو اتفاق پیدا ہو گیا۔

مولانا آزاد کی زندگی کا یہ عبوری دور خاص دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ انھوں نے یہ حالات کم و بیش پوری تفصیل سے مولانا عبدالرزاق ملخ آبادی کو بتائے تھے۔ اور ملخ آبادی مرحوم نے یہ اپنی کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی کہانی" میں شائع کر دیے ہیں۔

مولانا آزاد کی یہ داستان حیات ان کی بغاوت کا اتنا عظیم الشان اور تعلیمی لحاظ سے اتنا عبرتناک اعتراف ہے کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ چونکہ وہ نفسیات کے ماہر تھے اور مختلف تبدیلیوں اور ان کے وجوہ پر گہری نظر رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے ان کا پوری شرح و بسط سے جائزہ لیا ہے۔

بہر حال غالب کی طرح ان کی بھی "دین بزرگاں" سے بغاوت ان دونوں کے کردار کی پہلی مماثلت ہے۔

یہ تو دین کی بات تھی۔ لیکن مولانا آزاد کی دنیا میں بھی یہی پیش آیا۔ غالب کی دنیا شاعری تک محدود تھی، جس میں انھوں نے اپنے عمل سے یہ نظریہ پیش کیا

نمی رویم برا ہے کہ کارواں رفت است

مولانا آزاد نے سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں انھوں نے اپنا مشہور ہفتہ وار "الہلال" جاری کیا۔ اگرچہ اس کا اصلی مقصد دعوت اور مسلمانوں کو اسلام اور عقائد

۵۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبان: ۳۵۲-۴۲۴ (حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی - ۱۹۵۸ء)

صحیح کی طرف واپس بلانا تھا، لیکن ناممکن تھا کہ وہ سیاست سے اپنا دامن بچا کے نکل جاتے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں کا سوادِ اعظم سرسید احمد خان کی تعلیم و تلقین کے زیر اثر انگریز پرستی اور کانگریس دشمنی پر گویا متفق تھا۔ سرسید احمد خان کا تو انتقال ہو چکا تھا، لیکن ان کا لگایا ہوا پودا پورے برگ و بار سے چھتتا درخت بن گیا تھا۔ اور علی گڑھ اسکول کا ہر طرف بول بالا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس صورتِ حال کے خلاف بغاوت کی اور "الہلال" کے ذریعے مسلمانوں کو بتایا کہ ان کانگریزوں کی حکومت پر رونا مند ہو جانا اور ان سے تعاون کرنا اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے، انھیں اپنی یہ روش ترک کر کے آزادی کی جنگ میں برادرانِ وطن کے دوش بدوش کھڑا ہو جانا چاہیے۔ اپنے اس نظریہ پر انھوں نے قرآن و حدیث سے استدلال کیا۔ "الہلال" اور اس کا مشتق "البلاغ" ۱۹۱۵ء تک جاری رہے۔ اس کے بعد انھیں رنجی میں نظر بند کر دیا گیا، جہاں سے وہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں رہا ہوئے۔ اب انھوں نے سیاست کو اپنا ہمہ وقتی مشغلہ بنایا اور ملک کی آزادی کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے دیا۔ یوں انھوں نے غالب کی طرح دین و دنیا دونوں میں بغاوت کا مظاہرہ کیا۔ دونوں کی زندگی کا ایک اور پہلو سے بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

غالب کا فروری ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا اور مولانا آزاد اس کے ساڑھے تیس برس بعد اگست ۱۹۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ دونوں میں زمانے کے لحاظ سے کچھ ایسا طویل فاصلہ نہیں اور دونوں انیسویں صدی ہی کی پیداوار کہے جاسکتے ہیں، خصوصاً جب یہ ملاحظہ رہے کہ مولانا آزاد کی تعلیم بہت حد تک انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں اپنے زمانے سے بہت آگے تھے، اور دونوں کو اس بات کا شدید احساس بھی تھا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی اہم بات یہ ہے کہ دونوں کی انابت بہت شدید اور ہمہ گیر تھی۔ شاعر کا احساسِ انابت بالعموم تعلیٰ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ غالب نے ایسے ایسے

طریقے سے تعلق کی ہے کہ ان کے بیشتر شارحین نے دیوانِ غالب کے اس طرح کے اشعار کے اصلی معنی تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جن اشعار میں انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف تعلق کی ہے، وہ آپ سب کے سامنے ہیں مثلاً:

ربنختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب!
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ہیں اور بھی دنیا میں سخن در بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا بے اندازہ بیال اور
وغیرہ

لیکن متعدد اشعار میں انہوں نے براہِ راست صراحت سے تعلق نہیں کی، حال آں کہ ان کا مقصد یہی تھا۔ مثلاً کہتے ہیں:

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں کیما تھے
بے سبب ہو غالب! دشمن آسماں اپنا

مقصود اپنی دانائی اور یتیمی کا اعلان تھا۔ لیکن ظاہر اسے یوں کہا جیسے کہ اپنی بدقسمتی اور محرومی کا تذکرہ کر رہے ہوں کہتے ہیں کہ دنیا میری دشمن اور مخالف اس باعث ہے کہ وہ میری دانائی یعنی قدرتِ کلام اور یتیمی یعنی شرگوئی میں ہمہ گیری اور بے ہمتائی برداشت نہیں کر سکتی۔

ایک اور شعر دیکھیے:

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس، اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلیپدیر متاعِ ہنر کو میں

یہاں اپنے سواے ساری دنیا کو بے ہنر اور ہنر کا قدر شناس قرار دے دیا ہے۔ ایک اور شعر دیکھیے، کیسے جملہ متقدمین اور معاصرین پر اپنی فضیلت بیان کی ہے۔

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے!
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

کہتے ہیں کہ میری قابلیت اور بلندی کا شاعر آج تک پیدا ہی کہاں اور کب ہوا! اس پہلو سے میں پہلا شخص ہوں۔ اگر میری مانند پہلے کوئی اور ایسا شخص پیدا ہوا ہوتا تو آپ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہمارے پاس اس کی مثال پہلے سے موجود ہے۔ یعنی جس طرح آپ سہواً دوبارہ لکھی ہوئی عبارت کو فاضل یا غلط قرار دے کر قلمزد کرتے ہیں یا مٹا دیتے ہیں۔ آپ یہ سلوک مجھ سے نہیں کر سکتے کیونکہ میں حرفِ مکرر ہوں ہی نہیں، میری شان کا، میری لیاقت اور قابلیت کا کوئی شخص (شاعر) آج تک پیدا ہی نہیں ہوا پس مجھے کیوں کر مٹایا جاسکتا ہے!

غرض یہ سلسلہ طویل ہے۔ بس ایک شعر اور سن لیجیے:

اپنی گلی میں، جنبہ کو زکرو فن، بعد قتل
میرے پتے سے، خلق کو کیوں تیرا گھر ملے!

بظاہر اس شعر کا تعلق سے کوئی تعلق نہیں، لیکن بنیاد یہ بھی اسی قبیل کا، یہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ میں اتنا بڑا آدمی اور عظیم شاعر ہوں کہ یہ لا بد ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری قبر زیادہ تگاہ خواص و عوام بن جائے۔ اس طرح لوگوں میں تمھارے گھر کا پتہ یوں مشہور ہو جائیگا کہ اسے وہی گلی جس میں غالب کی قبر ہے۔ شعر کو ایک مرتبہ پھر دیجیے:

اپنی گلی میں، جنبہ کو زکرو فن، بعد قتل
میرے پتے سے، خلق کو کیوں تیرا گھر ملے!

تو آپ نے دیکھا کہ انھوں نے کیسے کیسے پہلو بہاں کر تعلق کی سبب حقیقت بہت کر تعلق ہے اس شخص کا خاصہ ہے جسے اپنی برگزیدگی اور عظمت کا اور اسی کے ساتھ زمانے کی نیرنگی ناقدری اور قدر ناشناسی کا احساس ہو۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ دنیا کسی طبعِ میری بزرگی کا اعتراف کرنے اور مجھے میرا حق دینے پر تیار نہیں تو وہ اس ناانصافی کے نشان اور زیادہ احتجاج کرتا ہوا تنقیدی توانی پر اتر آتا ہے۔ اور اپنا ڈھنڈورا خود پیٹنے لگتا ہے۔ غالب بھی مایوس ہو کر یہ کہنے پر

مجبور ہو گئے تھے :

میں عندیہ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

یعنی ابھی وہ لوگ پیدا ہی نہیں ہوئے جو مجھے سمجھ سکیں اور پہچان سکیں۔ یہ بہت بڑا دعویٰ تھا۔ لیکن زمانے نے ان کے اس دعوے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ ان کی وفات پر سو سو سال گزر چکے ہیں اور آج بھی ان کے کلام کی نئی نئی شریں لکھی جا رہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم نے تسلیم کر لیا کہ ان کے ہمعصر نہ ان کا کلام سمجھ سکے نہ اس کی صحیح داد دے سکے۔ ”وہ گلشنِ نا آفریدہ“ جس میں ان کے نعمات کی صحیح داد دینے والے پیدا ہوتے اور جس کی انھیں تمنا تھی، کہیں اب جا کر، سو صدی بعد پیدا ہوا ہے۔

خود غالب کی ساری عمر یہی دلی آرزو رہی اور وہ لوگوں کی محرومی کا ماتم کرتے ہوئے اس جہان سے گزر گئے! دیکھیے، کس حسرت سے کہتے ہیں۔

پنجاہ و دو سال مغزِ سخن کا فتم۔ امروز کہ شست و ششمین سال از عمر
گزراں می گذرد، سخن آفرین را سپاس گزارم و ہم جزاں بخشہ بخشایش
گر کس نیار و دانست کہ، دریں پنجاہ و دو سال چه درہائے معنی بروے من
کشادہ اند و کرسی اندیشہ مراد در فرارستان آگہی بکدام پایہ نہادہ اند۔ حیث
کہ ابناے روزگار حسن گفتار مرانشناختند! مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ
کامیاب شناساے فرّہ ایزدی نگشتند و ازین نمایش اسے نظر فرود
کہ در نظم و شعر بکار بردہ ام، سرگراں گزشتند۔ گوی نظیری ہمدرد من
مقطع آل مینو آرا مشکاہ نواے ساز دم سرد من است :

تو نظیری! از فلک آمدہ بودی، چو مسیح

باز پس رفتی و کس قدر تو شناخت، دریغ!

(میں نے باون برس دماغ سوزی کی۔ اب کہ میری زندگی مستعار کا

۶۔ درفش کاویانی : ۱۳۱-۱۳۲ (اکمل المطابع، دہلی ۱۸۶۵ء)

۶۶ واں برس گزر رہا ہے، میں اُس سخن آفریں خداے برتر کا شکر ادا کرتا ہوں؛ اور اس بے انتہا بخشے والے کے سواے اور کون جانتا ہے کہ ان بادن برسوں میں اُس نے کلام کے کیسے کیسے جواہرات مجھے عطا کیے، اور عقل و دانش کے کس بلند مقام پر مجھے سرفراز کیا۔ افسوس کہ میرے ہمصوروں نے میرے کلام کا حسن نہ پہچانا۔ میرا دل اُن کی نا فہمی پر جلتا ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت کی شناخت سے محروم رہ گئے اور میری نظم و نثر کے ان حسین شاہکاروں سے سرسری طور پر گزر گئے۔ تم کہو گے کہ نظیر سی نے یہ شعر گویا میرے ہی لیے کہا تھا:

تو نظیر سی! ز فلک آمدہ بودی چو مسیح

باز پس رفتی و کس قدر تو شناخت دینغ

کیا اس سے بڑی تعلق ہو سکتی ہے؟ اور اس کے لکھنے والے کی انا کی کوئی انتہا ہے!

غالب کی طرح مولانا آزاد کی انا بھی کسی سے مخفی نہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ میں اس عہد کا آدمی نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غالب چونکہ شاعر تھے، لہذا انھوں نے اپنا مافی الضمیر زیادہ تر شعر میں بیان کیا اور وہ بھی اشارے کنایے میں، بالواسطہ طریقے پر۔ مولانا آزاد نے نثر میں صاف صاف صراحت سے یہی کہ دیا — "غبارِ خاطر" میں لکھتے ہیں:

بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے جس کی مانگ ہوتی ہے۔ اور چونکہ مانگ ہوتی ہے اس لیے ہر ہاتھ اُس کی طرف بڑھتا ہے اور ہر آنکھ اُسے قبول کرتی ہے۔ مگر میرا معاملہ اس سے بالکل الٹا رہا۔ جس جنس کی بھی عام مانگ ہوتی، میری دکان میں جگہ نہ پاسکی۔ لوگ زمانہ کے روز بازار میں ایسی چیزیں ڈھونڈ کر لائینگے، جن کا رواج عام ہو۔ میں نے ہمیشہ

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

ایسی جنس ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کی، جس کا کہیں رواج نہ ہو۔ اوروں کے لیے پسند و انتخاب کی جو علت ہوئی، وہی میرے لیے ترک و اعراض کی علت بن گئی۔ انھوں نے دکان میں ایسا سامان بچایا جس کے لیے سب کے ہاتھ بڑھیں۔ میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں، جس کے لیے سب کے ہاتھ بڑھ سکیں:

تماشِ دست زدِ شہرِ دودہ، ز منِ مطلب

متاعِ من ہمہ دریائی است یا کانی

لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگاتے ہیں، جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی، تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگائی، جہاں کم سے کم گاہکوں کا گزر ہو سکے:

در کوے ماشکتہ ولی می خرنند و بس

بازار خود فروشی ازاں سوے دیگرست

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا:

بارفیقان ز خود رفتہ، سفر دست نداد

سیر صحراے جنوں، حیف کہ تنہا کر دیم

جس راہ میں بھی قدم اٹھایا، وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب ٹرکے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی:

آں نیست کہ من ہمنفساں را بگزاردم

با آبلہ پایاں چہ کنم، تا فلتہ تیزست

اس تیز رفتاری سے تلواروں میں چھالے پڑ گئے۔ لیکن عجب نہیں کہ راہ

کے کچھ خص و خاشاک بھی صاف ہو گئے ہوں :

خاربا از اثر گرمی رفتارم سوخت

منت بر قدم راہ روان ست مرا

جیسا کہ سب کو معلوم ہے "غبارِ خاطر" قلم احمد نگر کی نظر بندی کے زمانے کی تصنیف ہے اور اس خط پر ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کی تاریخ پڑی ہے۔ اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ خیال انہیں اتنا بعد کو آیا۔ نہیں، وہ یہی بات اس سے بہت پہلے یعنی اکتوبر ۱۹۲۷ء میں غلام رسول مہر کو بھی لکھ چکے تھے :

"انسوس سے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا چیزیں جائیںگی :

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنس و نسا

رو نطقے گشتم و از طالع و کال رقم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و اہم کا ایک عجیب عالم ظاہری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم و فنون، ادب، انشا، شاعری — کوئی دوسری ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار نئی راہیں مبدع و فیاض نے بچھنا مراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن وہ ہر نقطہ نئی نئی بخششوں سے دامن دل مالا مال نہ ہوا ہو۔ جت سے کہ ہر روز اپنے آپ کو عالمِ معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پھیلنے منزلوں کی جلوہ طرازیوں مانڈ کر دیتی ہیں۔

لیکن انسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرا بنا کر کیا اس نے شاید سر و سامان کار کے اٹھائے تھے، دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی

کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا، مگر اس کے حوالہ
 کر دیا گیا۔“

دیکھا آپ نے، دونوں کو شکایت ہے کہ ہم اس دور کے آدمی نہیں تھے۔ غالب کہتے ہیں:
 میں عندلیب گلشنِ نافریدہ ہوں۔ وہ باغِ ابھی عالمِ وجود میں آیا ہی نہیں، جہاں میری
 شاعری کے سننے اور سمجھنے والے ہوں گے۔ اور مولانا آزاد کہتے ہیں:

”میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا، مگر
 اس کے حوالے کر دیا گیا۔“

غرض غالب اور مولانا آزاد کی افتادِ طبع ایک تھی۔ دونوں کو اپنی قابلیت اور صلاحیت کا گہرا
 اور بے پایاں احساس تھا اور دونوں زمانے کی ناشناسی اور ناقدری سے نالاں تھے۔ ولی
 راولی می شناسد۔ مولانا آزاد کو گویا اپنی برادری کا ایک اور شخص مل گیا۔ لا بد تھا کہ وہ غالب
 کا مطالعہ زیادہ غائر نظر سے کرتے۔

یہ اسی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اس صدی کے آغاز میں جب ہنوز غالب کے آنکھوں اور
 چاٹنے کا کام کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا، ”الہلال“ میں غالب سے متعلق ایک طویل ادارۃ
 قلمبند کیا جو واقعی مطالعہ غالب اور غالب شناسی کا نقطہ آغاز بن گیا۔

مولانا آزاد کی تعلیم عربی اور فارسی سے شروع ہوئی اور وہ بھی کاملاً دینی موضوعات تک محدود
 رہی۔ وقت کا مسلمہ نصاب ”درسِ نظامی“ تھا جو انھوں نے ۱۳-۱۴ برس کی عمر میں مکمل کر لیا۔
 غرض ان کی اس دور کی درسی مشمولیتوں میں اردو کا کوئی مقام نہیں تھا۔ جیسا کہ انھوں نے
 خود لکھا ہے، انھوں نے اپنے طور پر اردو کے ابتدائی اسباق اپنے والد کے خادم خاص حافظ
 ولی اللہ سے پڑھے اور مشق سے اس میں بتدریج اتنی صلاحیت پیدا کر لی کہ ۱۳ برس کی عمر میں
 وہ مدرس کے اخبار ”جریدہ روزگار“ کا مطالعہ کرنے اور اس سے استفادہ کرنے لگے تھے۔
 اسی زمانے میں انھوں نے اس پرچے میں حالی کی کتاب ”یادگار غالب“ کا اشتہار دیکھا، جس سے

کتاب دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے اسے منگوا کر پڑھا۔ یہ ان کا غالب سے پہلا تعارف تھا۔ چونکہ انہوں نے اس وقت اپنی عمر ۱۳ برس کی لکھی ہے، لہذا یہ تقریباً ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کا واقعہ ہوگا۔

”یادگار غالب“ میں برہان قاطع کے معرکے کا حال دیکھا تو اس سلسلے کی جملہ کتابیں حاصل کیں۔ کہتے ہیں:

اس زمانے میں مجھے فارسی ادب اور فارسی لغات کے مطالعہ و تحقیق کا بھی شوق تھا اور تصحیح الفاظ کی بڑی کاوش رہتی تھی۔ اس لیے پوری دلچسپی کے ساتھ مطالعے کا موقع ملا۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا غالب نے (قاطع برہان کے) یہ چند اجزاء لکھ کر علم و تحقیق کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

فارسی انہوں نے اپنی تعلیم کے دوران میں پڑھی تھی اور اس کے ادب کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ غالب کے فارسی کلام سے بھی متعارف اور مانوس ہوئے۔

اہلال کے مشاٹر ایہ ادارے کی شان نزول یہ تھی کہ وہ دلی آئے۔ یہاں ان کی نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رختاں کے بڑے صاحبزادے نواب سعید الدین احمد خان غالب سے ملاقات ہوئی۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے یہ باپ بیٹے دونوں غالب کے قریبی عزیز اور شاہی میں ان کے شاگرد بھی تھے۔ نیر توفیق ہو چکے تھے، لیکن غالب یہیں دلی میں رہتے تھے۔ غالب کے پاس غالب کے اردو دیوان کا جو نسخہ تھا، اس کے حاشیے پر کچھ ایسا کلام درج تھا جو نہیں شائع نہیں ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے غالب سے یہ نسخہ دیوان مستعار لیا اور حاشیے کے اس غیر مطبوعہ کلام کی نقل لے لی۔ کلکتے واپس جا کر انہوں نے اسے اہلال میں شائع کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے تعارف کے طور پر یہ ادارہ سپرد قلم ہوا۔

یہ ادارہ خاصاً طویل ہے۔ اس میں انہوں نے غالب کی زندگی کے مختلف، انعامات کی عظمت اشارہ کیا ہے؛ خاندانِ مغلیہ کے آخری ایام کی زبوں حالی اور بہادر شاہ ظفر کی بیکسی اور بے بسی کا ذکر کیا ہے۔ نمنماً، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے کچھ حالات بیان کیے ہیں اور آخر میں

فرمایا ہے کہ غالب کا غیر مطبوعہ کلام جمع کر کے شائع کیا جائے۔ یہ گویا اپنی طرف سے محولہ فوق کلام کے شائع کرنے کا اعلان تھا۔

جو کلام انھیں طالب کے نسخے سے ملا تھا وہ پہلی مرتبہ الہلال اور البلاغ میں شائع ہوا۔ الہلال کے تین شماروں میں اور البلاغ کے ایک شمارے میں۔ اس کی تفصیل یوں ہے:

الہلال:

(۱) ۱۶ جون ۱۹۱۴ء (تصیدہ): کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام

فرما نرواے کشور پنجاب کو سلام

(۲) یکم جولائی ۱۹۱۴ء (غزل): ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیڈ ہوں

میں دشتِ غم میں آہوے صیا دیدہ ہوں

(۳) ۲۲ جولائی ۱۹۱۴ء (غزل): شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ

ہوا ہے موجب آرام جان تن تکیہ

البلاغ:

(۴) ۲۴، ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء (مشترکہ شمارہ) نواب یوسف علی خاں کے غسلِ صحت

کی تہنیت میں تصیدہ۔

مرحبا، سالِ فرخی آہیں

عیدِ شوال و ماہِ فروردیں

جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے، کچھ کلام ضائع بھی ہو گیا تھا جسے وہ شائع نہیں کر سکے۔

لیکن مولانا آزاد کی غالب کے سلسلے میں مہتمم باشان اور قابل ذکر یادگار ان کی وہ تعلیقات اور

حواشی ہیں جو انھوں نے غلام رسول مہر کی کتاب "غالب" پر قلمبند کیے تھے۔ ہوا یہ کہ جب مہر

نے اپنی کتاب کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں ہدیہ بھیجا تو مولانا نے کتاب دیکھنے کے بعد مہر کو

لکھا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ غالب کی مکمل سوانح عمری لکھنے والے ہیں، ورنہ میں کچھ

یادداشتیں جو میرے علم میں ہیں، لکھ کر آپ کو بھیج دیتا۔ اس پر مہر نے کتاب کا ایک اور نسخہ

لیا اور اس کی جلد یوں بندھوائی کہ ہر مطبوعہ ورق کے بعد سادہ کاغذ لگوا دیا اور اسے مولانا

آزاد کی خدمت میں بھیج دیا تاکہ وہ جب کتاب دیکھیں اور جہاں کہیں انھیں کچھ اضافہ کرنا منظور ہو، اسے بہ آسانی سادہ ورق پر لکھ سکیں۔ مہر صاحب کو بہت انتظار کرنا پڑا۔ مولانا آزاد کی گونا گوں مصروفیتیں، اس پر سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں سفروں کا لامتناہی سلسلہ۔ کتاب کا یہ نسخہ مدتوں ان کے پاس رہا۔ جب بھی فرصت ملتی، وہ اسے اٹھا لیتے اور کچھ نہ کچھ لکھ دیتے۔ آخر تین برس بعد، ۱۹۴۰ء کے آغاز میں انھوں نے کتاب مہر صاحب کے پاس واپس بھیج دی۔ مولانا نے جو تعلیقات سپردِ قلم کی تھیں، مہر نے انھیں کتاب کی طبع ثانی میں ان کے نام سے شامل متن کر لیا۔ (بعد کو انھوں نے یہ سارا مواد مولانا مرحوم کے مجموعہ خطوط "نقش آزاد" میں بھی اضافہ کر دیا تھا)

یہ حواشی ایسے قیمتی اور معلومات افزا ہیں کہ ان سے واقعی مہر کی کتاب کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ مولانا آزاد کا اپنا مطالعہ ہی کچھ کم وسیع اور متنوع نہیں تھا۔ اس پر حافظ اس بلا کا کہ جو ایک مرتبہ دیکھ لیا، وہ ہمیشہ کے لیے نہانخانہ دماغ میں محفوظ ہو گیا اور مستحضر بھی۔ دوسرے یہ کہ ان کے تعلقات اپنے زمانے کے مشاہیر علم و ادب سے تھے۔ ان اصحاب سے انھوں نے جو کچھ غالب سے متعلق سنا، انھوں نے اسے ان حواشی میں منتقل کر دیا۔ ان حضرات میں لوہارو کے نواب سر امیر الدین احمد خان بھی تھے۔ ان سے ان کے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ مولانا آزاد کو غالب کی زندگی کے بارے میں بہت سی تفصیلات نواب صاحب موصوف ہی سے ملی تھیں۔ یہ بھی انھوں نے ان تعلیقات میں محفوظ کر دی ہیں۔ اگرچہ بعد کی جستجو اور تحقیق سے یہ تمام معلومات من و عن درست ثابت نہیں ہوئیں۔ لیکن جتنا کچھ صحیح ہے، وہ بھی نہ مقدار میں کم ہے نہ اہمیت کے لحاظ سے معمولی دہجے کا۔ یہ پورا مواد آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے اور اس پر کسی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آخر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں اتنے سارے مختلف علوم مولانا آزاد کے مرہونِ منت ہیں، وہیں خوش قسمتی سے اردو ادب بھی ان کے رشحاتِ قلم سے محروم نہیں رہا۔ افسوس زمانے نے انھیں اتنی فرصت نہ دی کہ وہ اس پر اور اضافہ کر سکتے لیکن جتنا کچھ وہ چھوڑ گئے ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں۔ فالمد اللہ۔

غبارِ خاطر

اس ملک پر انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے خلاف ہماری پچاس سالہ جدوجہد کا نقطہ عروج وہ تھا جسے "ہندستان چھوڑ دو" تحریک کہا گیا ہے۔ ۸ اگست ۱۹۴۷ء کو انڈین نیشنل کانگریس کا خاص اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، جہاں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ انگریز اس ملک کے نظم و نسق سے فوراً دست بردار ہو کر یہاں سے سدھاریں اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ اسی لیے اس کے بعد جو تحریک شروع ہوئی، اس کا نام "ہندستان چھوڑ دو" تحریک پڑ گیا۔

اس وقت دوسری عالمی جنگ اپنے پورے شباب پر تھی۔ انگریز بھلا ایسی قرارداد اور ایسی تحریک سے کیونکر صرف نظر کر سکتا تھا! اخباروں میں اس طرح کی افواہیں پہلے سے چھپ رہی تھیں کہ کانگریس اس مفاد کی قرارداد منظور کرنے والی ہے۔ اس لیے حکومت نے حفظِ ماتقدم کے طور پر سب انتظام کر رکھے تھے۔ اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ ۸ اگست کی شب کو دیر تک یہ جلسہ جاری رہا جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اسی رات کے آخری حصے میں یعنی ۹ اگست، علی الصبح حکومت وقت نے تمام سرکردہ رہنماؤں کو سوتے میں بستروں سے اٹھا کر حراست میں لے لیا اور ملک کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔ مولانا آزاد اور ان کے بعض دوسرے رفقا احمد نگر کے قلعے میں رکھے

گئے تھے۔ مولانا آزاد کا یہ سلسلہ قید و بند کوئی تین برس تک رہا۔ اولاً اپریل ۱۹۴۵ء میں وہ احمد نگر سے بانکوڑا جیل میں منتقل کر دیے گئے، اور یہیں سے بالآخر ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے۔ اسی نظر بندی کے زمانے کا ثمرہ کتاب "غبارِ خاطر" ہے۔ "غبارِ خاطر" مولانا آزاد مرحوم کی سب سے آخری تصنیف ہے، جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ کہنے کو تو یہ خطوط کا مجموعہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ایک چھوڑ کر، ان میں سے مکتوب کی صفت کسی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ دراصل چند متفرق مضامین ہیں، جنہیں خطوط کی شکل دے دی گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کچھ ایسی باتیں لکھنا چاہتے تھے جن کا آپس میں کوئی تعلق یا مربوط سلسلہ نہیں تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس طرح کے مضامین لکھنے کا خیال ان کے دل میں شہرہ آفاق فرانسس مصنف اور فلسفی چارلس لوئی مونٹسکیو کی مشہور کتاب "ناری خطوط" (۱۷۲۱ء) سے آیا ہو۔ اس کتاب میں دو فرضی ایرانی سیاح — اوزبک اور رجا — فرانس پر عموماً اور پیرس کی تہذیب و تمدن پر خصوصاً بے لاگ اور طنزیہ تنقید کرتے ہیں، اسلام اور عیسائیت پر آزادانہ اظہارِ خیال کرتے ہیں، جو اس عہد کی نسوویت تھی۔ اس میں کئی اور سیاسی اور مذہبی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ اس کتاب کا دوسری زبانوں کے علاوہ عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

لیکن وہ ان باتوں کو الگ الگ مضامین کی شکل میں بھی قلمبند نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ اس صورت میں تعلق کے فقدان کے باعث بعد کو انہیں ایک شیرازے میں بچا کرنا آسان نہ ہوتا۔ اس مشکل کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ انہیں کسی شخص واحد کے نام خطوں کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔ ان کے تعلقاً احباب میں صرف ایک، ہستی ایسی تھی جو علم کی مسافت امتنا میں یکساں طور پر دلچسپی لے سکتی تھی۔ یہ نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمن نسان شروانی مرحوم کی ذات تھی۔ انہوں نے عالم خیال میں انہیں کو مخاطب تصور کر لیا اور پھر جب کبھی، جو کچھ بھی ان کے خیال میں آتا گیا، اسے بی تکلف حوالہ قلم کرتے گئے، انہیں مضامین یا خطوط کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔

شروانی خاندان بہت مشہور ہے اور اس کی تاریخ بہت قدیم۔ ہندستان کے اسلامی عہد

میں اس خاندان کے متعدد افراد بڑے صاحبِ اثر و نفوذ گزرے ہیں، یہاں تک کہ کسی مرتبہ حکومتِ وقت کے رد و بدل میں ان کی حیثیت "بادشاہِ گر" کی ہو گئی۔ ان کے اس عہد کے کارنامے ہماری تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

لیکن ان کا یہ دور دورہ یہاں سلطنتِ مغلیہ کے قیام سے پہلے ہی تک رہا۔ چونکہ ہمایوں کے مقابلے میں شروانیوں نے شیرشاہِ سُوری کا ساتھ دیا تھا، اس لیے جب ایرانیوں کی مدد سے ہمایوں نے دوبارہ اس ملک پر اپنا تسلط جالیا، تو اب قدرتی طور پر شروانیوں کا ستارہ زوال میں آ گیا۔ ان کی جمیعت شمالی ہند میں منتشر ہو گئی؛ ان میں سے بیشتر نے مکرین کھول دیں اور سپاہِ گری کی جگہ کشاورزی کو اپنا پیشہ بنالیا۔ ان کے زیادہ تر افراد پنجاب کے اطراف اور علی گڑھ اور ایٹھ کے اضلاع میں بس گئے؛ یہاں انھوں نے بڑی بڑی جاگیریں اور زمینداریاں پیدا کر لیں۔

پہلے ان کے ہاتھ میں تلوار تھی، تو اب ہل تھا؛ اس لیے مدتوں ان لوگوں نے قلم سے بہت کم سروکار رکھا۔ زیادہ سے زیادہ کسی نے ہمت کی، تو دینی پہلو سے اتنی استعداد پیدا کر لی کہ روزمرہ کے مسائل میں شہد ہو جائے۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ سیاسی انقلاب کی جو آندھی مغرب سے اٹھی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سیاسی استحکام و اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد انگریزوں نے یہاں نئے طور طریقے، نئے انتظام، نئی زبان، نئی تعلیم جاری کر دی۔ قدرتی طور پر اس کا بہت وسیع اثر ہوا۔ اب یہ ناممکن تھا کہ آبادی کا کوئی طبقہ اس سے مستغنی رہ سکے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ شروانیوں کا رجحان بھی پڑھنے لکھنے کی طرف ہوا، اور انگریزی عہد میں انھوں نے جدید تعلیم سے متمتع ہو کر ملکی معاملات میں برادرانِ وطن کے دوش بدوش کام کرنا شروع کیے۔ انگریزی استیلاء و اقتدار کے خلاف ہماری جنگِ آزادی میں بھی اس خاندان کے بعض افراد کی خدمات بہت نمایاں اور قابلِ قدر رہی ہیں۔

اسی شروانی خاندان کے گلِ سرسبد نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم تھے۔ وہ ۵ جنوری ۱۸۶۷ء (۲۸ شعبان ۱۲۸۳ھ) کو بھیکم پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا

خاندان یہاں انیسویں صدی کے اوائل میں آکر آباد ہوا تھا اور ان کے آبا و اجداد یہاں کے رئیس تھے۔ ان کے والد محمد تقی خان صاحب (ف ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ) نے اپنے بڑے بھائی عبدالشکور خان کی حین حیات خاندانی جاواد اور زمینداری کے نظم و نسق میں کوئی حصہ نہیں لیا؛ بلکہ خود مولانا حبیب الرحمن خان کی تعلیم و تربیت بھی اپنے تایا صاحب کی نگرانی میں ہوئی۔ ان کی علوم عربیہ و فارسیہ کی متعدد شاخوں میں تعلیم خاص اہتمام سے مختلف اساتذہ کی رہنمائی میں مکمل ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی کی طرف توجہ کی، اور اس میں بھی بقدر ضرورت خاصی استعداد پیدا کر لی۔ ہونہار بردا کے چکنے چکنے پات شروع ہی سے ان کی ذہانت و فطانت اتنی نمایاں تھی کہ ان کے والد نے موروثی صدر مقام بھیکم پور سے متصل ایک نئی گڑھی تعمیر کی؛ اس کے اندر دلکش باغات لگائے، عالیشان مکان بنوائے اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر حبیب گنج رکھا۔ عبدالشکور خان صاحب کا سفر حج سے واپس آتے ہوئے ۱۹۰۶ء (۱۳۲۵ھ) میں جدہ میں انتقال ہو گیا۔ چونکہ چھوٹے بھائی محمد تقی خان صاحب ان سے دو برس پہلے رحلت کر چکے تھے، اب ریاست کے انتظام کی ذمہ داری مولانا حبیب الرحمن خان کے کندھوں پر آ پڑی۔ اسے انھوں نے اپنی خدا داد فراست اور ذوراندیشی سے ایسی عمدگی سے انجام دیا کہ نہ صرف پانچ لاکھ کی مقرض ریاست اس بارگراں سے بکدوش ہو گئی بلکہ اس میں دن دو گنی رات چو گنی ترقی ہوتی گئی؛ اس کی تفصیل میں جانے کا نہ یہ موقع مہل ہے، نہ اس کی ضرورت۔ لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف صاحب علم اور علم دوست ہی نہیں تھے؛ بلکہ ان میں انتظامی قابلیت اور دنیوی سوچ بوجھ بھی بڑا کی تھی۔ دو چیزیں جو بہت کم کسی ایک شخصیت میں جمع ہوتی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن خان کی تعلیم و تربیت جس پنچ اور معیار پر ہوئی تھی، اس نے بہت جلد انھیں ملک کے علمی حلقوں میں متعارف کرادیا۔ ان کا مزاج خالص علمی تھا۔ انھوں نے اپنے ذاتی شوق سے زر کثیر خرچ کر کے حبیب گنج میں ایک نا در اور قیمتی کتاب خانہ جمع کیا جس کی شہرت ملک سے باہر تک پہنچی۔ ان کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے اصحاب مجاز نے انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کا صدر مقرر کر دیا۔ یہیں سے ان کی شہرت دکن پہنچی جس پر آصف بسا ہ ہفتم

میر عثمان علی خان بہادر نظام دکن نے انھیں اپنی ریاست کے امور مذہبی کا صدر الصدور بنا کر جون ۱۹۱۸ء میں حیدرآباد بلوایا۔ دکن میں ان کی علمی اور تعلیمی اور دینی خدمات ایسی وسیع اور گوناگوں ہیں کہ ان کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، حیدرآباد میں دارالترجمہ اگست ۱۹۱۶ء میں قائم ہوا تاکہ کتابوں وغیرہ کے ترجمے اور اصطلاحات وضع کرنے کا کام کیا جاسکے؛ لیکن عثمانیہ یونیورسٹی اس سے دو سال بعد ۲۸ اگست ۱۹۱۹ء کو قائم ہوئی۔ اپنی عمارت نہ ہونے کے باعث اس کی افتتاحی تقریب آغا منزل میں ہوئی تھی۔ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی اس کے پہلے شیخ "وائس چانسلر" مقرر ہوئے۔ اسی سال اپنے عہدے کی مناسبت سے اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے 'صدر یار جنگ' خطاب عطا ہوا۔ حیدرآباد میں ان کا قیام اپریل ۱۹۳۰ء تک رہا۔

ملک جس سیاسی بحران اور کشمکش سے گزر رہا تھا، اس کے پیش نظر کسی شخص کا سیاسیات سے بالکل بے تعلق رہنا ناممکن تھا؛ تاہم خواجہ صدر یار جنگ نے اس میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ حیدرآباد سے واپسی پر انھوں نے اپنی تمام توجہ ملک کے متعدد تعلیمی اور علمی اداروں کے فروغ و ترقی پر مبذول کر دی۔ ملک کی شاید ہی کوئی ایسی قابل ذکر علمی انجمن ہوگی، جس سے ان کا تعلق نہ رہا ہو۔

مرحوم شاعر اور مصنف بھی تھے، حسرت تخلص تھا۔ اردو میں منشی امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ فارسی کلام آغا سنجر ایرانی کو دکھاتے تھے؛ کچھ مشورہ خواجہ عزیز لکھنوی اور مولانا شبلی سے بھی رہا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دیوان مطبوعہ موجود ہیں۔ اردو میں کاروان حسرت اور فارسی میں بوستان حسرت۔ اور بھی متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں؛ سیرۃ الصدیق، تذکرہ بابر، حالاتِ حزیں، علمائے سلف، نابینا علماء ان میں سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے متفرق مضامین کا مجموعہ بھی "مقالاتِ شروانی" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

ان کا بروز جمعہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء (۸ ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ) کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ علی گڑھ سے تقریباً ۲۵ میل کے فاصلے پر بھموری میں اپنے موروثی قبرستان میں آسودہ خوابِ ابدی ہیں؛ یہ جگہ حبیب گنج سے کوئی میل بھر دور ہوگی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

نواب صدر یار جنگ سے مولانا آزاد کے تعلقات ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں مولانا شبلی مرحوم واسطہ العقد ثابت ہوئے، جن سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء کے وسط میں بمبئی میں ہوئی تھی۔ جب یہ مولانا شبلی سے ملے ہیں تو وہ ان کی وسعت مطالعہ، ذہن کی برائی اور حافظے سے بہت متاثر ہوئے، وہ خود ان دنوں حیدرآباد میں ملازم تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کو دعوت دی کہ یہاں آجاؤ اور الندوہ کی ترتیب و تدوین اپنے ہاتھ میں لے لو۔ لیکن مولانا آزاد کسی وجہ سے یہ دعوت قبول نہ کر سکے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا شبلی کی عمر اس وقت ۴۸ سال کی تھی اور مولانا آزاد کی ۱۷ کے لگ بھگ۔ مزید یہ کہ اس وقت ملک کے علمی حلقوں میں شبلی عالم اور ادیب اور مصنف کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے؛ اور الندوہ بھی یکسر علمی پرچہ تھا، ایسی صورت میں ان کا اس نوجوان کو اپنا ہمکار بننے اور علمی رسالے کی باگ ڈور سنبھالنے کی دعوت دینا، جہاں ایک طرف ان کی اپنی وسعت قلب اور علم دوستی، قدر شناسی اور خرد نوازی کا مین ثبوت ہے، وہیں مولانا آزاد کے غیر معمولی علم و فضل اور صلاحیتوں کا بھی بہت بڑا اعتراف ہے۔

اس کے تھوڑے دن بعد مولانا شبلی حیدرآباد سے مستعفی ہو کر اگست ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معاملات کے گویا کرتا دھرتا بن گئے۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے تجدید دعوت کی۔ اب کی مولانا آزاد نے اسے قبول کر لیا۔ چنانچہ یہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک سات مہینے الندوہ (لکھنؤ) کے ادارہ تحریر سے منسلک رہے۔ نواب صدر یار جنگ سے ملاقات اسی ۱۹۰۶ء کی پہلی سہ ماہی میں ہوئی تھی۔ مولانا شبلی اور نواب صاحب مرحوم کے باہمی تعلقات کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ مولانا آزاد بھی لکھنؤ کے دوران قیام میں دارالعلوم میں مولانا شبلی ہی کے ساتھ مقیم تھے۔ اسی لیے میرا گمان ہے کہ جب نواب صاحب اس زمانے میں لکھنؤ گئے، تو مولانا شبلی کے مکان پر ان دونوں کی ملاقات ہوئی ہوگی۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان تعلقات میں خلوص اور پختگی اور ایک دوسرے کی مقام شناسی کا جذبہ پیدا ہوتا گیا۔ انہی تعلقات کا ایک باب یہ کتاب ہے۔

(۲)

”غبارِ خاطر“ کسی لحاظ سے بہت اہم کتاب ہے؛

مولانا مرحوم کے حالات، بالخصوص ابتدائی زمانے کے، اتنی شرح و بسط سے کسی اور جگہ نہیں ملتے، جتنے اس کتاب میں۔ ان کے خاندان، ان کی تعلیم اور اس کی تفصیلات، حادثات، نفسیات، کردار، امیال و عواطف، ان کے کردار کی تشکیل کے محرکات۔ ان سب باتوں پر جتنی تفصیل سے انھوں نے ان خطوں میں لکھا ہے اور کہیں نہیں لکھا؛ اور ان کے سوانح نگار کے لیے اس سے بہتر اور موثق تر اور کوئی ماخذ نہیں۔

اس کتاب کی دوسری اہمیت اس کا اسلوبِ تحریر ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں نظم و نثر لکھنے لگے تھے اور اسی زمانے میں ان کی تحریریں رسائل و جرائد میں چھپنے لگی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی تحریروں میں وہ نچنگی نہیں تھی، ہو بھی نہیں سکتی تھی، جو مشق اور مرورِ زمانہ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ اگر ہم اس پورے مجموعے پر تنقیدی نظر ڈالیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ زبان و بیان کے لحاظ سے ان کے اسلوبِ نگارش کا نقطہٴ عروج ”غبارِ خاطر“ ہے۔ اس کی نثر ایسی پی تلی ہے اور یہاں الفاظ کا استعمال اس حد تک افراط و تفریط سے بری ہے کہ اس سے زیادہ خیال میں نہیں آسکتا۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں ناہمواری تھی۔ مثلاً اہلال اور البلاغ کے دور میں ان کے ہاں عربی اور فارسی کے ثقیل اور عسیر الفہم جملوں اور ترکیبوں کی بھرمار ہے۔ بیشک ان پرچوں کا خاص مقصد تھا اور ان کے مخاطب بھی تعلیم یافتہ لوگ بلکہ بہت حد تک طبقہٴ علماء کے افراد تھے۔ ان اصحاب سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ نہ صرف ان تحریروں کو سمجھ سکیں گے، بلکہ ان سے لطف اندوز بھی ہونگے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مطالب اس سے آسان تر زبان میں بیان نہیں ہو سکتے تھے۔ پس ظاہر ہے کہ عوام تو درکنار، متوسط طبقہ بھی ان سے پورے طور پر مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس ”غبارِ خاطر“ کو دیکھیے تو یہاں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ اس میں عربی و فارسی کی مشکل ترکیبیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس کی نثر ایسی شگفتہ اور دلنشین ہے کہ یہ نہ صرف ہر کسی کے لیے قریب الفہم ہے

بلکہ اس سے لطف لیا جاسکتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں موضوع سہل ہے، بیشک، یہ توجیہ ایک حد تک درست ہے؛ لیکن بس ایک حد ہی تک۔ اسی مجموعے میں انہوں نے دو خطوں میں خدا کی ہستی سے تفصیلی گفتگو کی ہے (خط ۱۲ اور ۱۳)۔ یہ موضوع آسان نہیں، بلکہ واقع یہ ہے کہ دنیا کا سب سے اہم اور مشکل اور پیچیدہ موضوع ہے ہی یہ۔ ابتدا سے دنیا بھر کے فلسفی اور عالم اور عاقل اس سے متعلق لکھتے آئے ہیں؛ اور تمام مذاہب کی علت غائی اور بنیاد ہی یہ مسئلہ ہے۔ اگر اسی مسئلے پر انہوں نے اس سے تیس برس پہلے لکھا ہوتا تو اس زمانے میں ان کی جو افتاد تھی اسے مد نظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا انداز اور اسلوب کیا ہوتا۔ لیکن یہاں انہوں نے جس طرح سے اس سے متعلق بحث کی ہے۔ اس سے جہاں ان کے طرز استدلال کی دل نشینی نمایاں ہے وہیں اسلوب تحریر کی دلکشی بھی لفظ لفظ سے پھوٹی پڑتی ہے۔ ایک ایک لفظ احتیاط سے کانٹے کی تول لکھا ہے۔ کہیں تکرار نہیں ہے، کہیں الجھاؤ نہیں ہے، نگاہ اور زبان کسی جگہ نہیں اٹکتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرے خط (نمبر ۱) میں انانیت کا مسئلہ زیر بحث آگیا ہے۔ یہ موضوع بھی آسان نہیں؛ اور زرا سی بے احتیاطی سے یہ نفسیات کی بھول بھلیوں اور علمی اصطلاحات کا مجموعہ بن سکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی انہوں نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے؛ بحث کو عام سطح پر رکھا ہے تاکہ پڑھنے والا اسے سمجھے اور لطف اندوز ہو۔ اس سے معلوم ہوگا کہ واقع اب نہایت مشکل مسئلوں اور موضوعوں سے متعلق بھی وہ ایسے انداز میں گفتگو کر سکتے تھے کہ یہ نہ صرف علم پہلو سے وسیع ہو؛ بلکہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ ایسی دلکشی کی حامل ہو کہ ہمارے تائید ادب کا حتم بن سکے۔

اس مجموعے کے بعض خطوط بادی النظر میں بہت معمولی باتوں سے متعلق ہیں۔ مثلاً، کجیت زان و بلبل (خط ۱۸) یا چڑیا چڑے کی کہانی (خط ۱۹، ۲۰)۔ بظاہر یہ ایسے عنوان ہیں جن سے تمسخر خیال نہیں ہوتا کہ کچھ زیادہ لکھا جاسکتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کی جولانی قلم کا یہ کرشمہ ہے کہ ان پر ۲۵ صفحے قلمبند کر دیے ہیں۔ ان کی دقت نگاہ، جزئیات کا احاطہ، غیر عادی اور غیر معمولی چیزوں

سے دلچسپی اور ان کی تفصیلات کا علم — غرض کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ اور پھر یہ سب کچھ ایسی سہل متنوع زبان میں بیان ہوا ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ یا مثلاً خط (۱۵) لیجئے جس میں اپنے چائے کے شوق کا ذکر کیا ہے۔ یہاں پھر ان کی باریک بینی اور مسئلے کے مالہ و مابلیہ کا تفصیلی ذکر نمایاں ہے۔ چائے کی پتی، اس کی کاشت کی تاریخ، اس کے دوسرے لوازمات — ان سب باتوں کا ذکر ایسے چٹخارے لے لے کر کیا ہے کہ خیال ہوتا ہے، یہ چائے نہیں، بلکہ شرابِ طہور یا آبِ کوثر و نسیم کا ذکر ہو رہا ہے۔ پینے کو چائے سب ہی پیتے ہیں، لیکن مولانا آزاد کا یہ خط پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ہم نے آج تک چائے کبھی پی ہی نہیں، بلکہ کوئی نقلی چیز میں دے دی گئی تھی جسے ہم لاعلمی میں اصلی سمجھتے رہے۔ یہ ان کے حُسنِ انشا اور قوتِ بیان کا معجزہ ہے۔

پھر ان خطوں کا ایک اور ماہر الامتیاز ان کا ہلکا سا فکاہی رنگ ہے جو جا بجا الفاظ کا پرودہ چاک کر کے جھانکنے لگتا ہے۔ انھوں نے اہلِ لالچ میں بھی بعض مقالے ایسے لکھے تھے، جن میں مزاح کا رنگ چوکھا تھا۔ وہاں موضوع سیاسی تھا، یہاں موضوع سخن سیاسی چھوڑ، ادبی بھی نہیں؛ لیکن اس میں بھی وہ وہ گل افشائیاں کی ہیں کہ صفحہ کاغذ کو کشتِ زعفران بنا کے رکھ دیا ہے۔ مثلاً احمد نگر کے قلعے میں باورچی رکھنے کا قصہ پڑھیے (خط ۸) یا ڈاکٹر سید محمود کا گوریاؤں کی ضیاء کا سامان کرنا (خط ۱۸)؛ یا چڑیا چڑبے کی کہانی (خط ۲۰) میں قلندر اور ملا کا حال — ان سب مقامات پر بین السطور مزاح کی کار فرمایوں نے پوری تحریر کو اتنا شگفتہ اور دلکش بنا دیا ہے کہ یہی جی چاہتا ہے؛ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

اسی سے ایک اور بات کا خیال کیجیے۔ یہ ان کی مختلف جانوروں کی شکل و صورت اور عادات و اطوار کی جزئیات کی تصویر کشی ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے حلقہٴ احباب میں سے کم و بیش روز کے ملنے والوں سے متعلق بھی اتنی تفصیل سے جانتے اور اپنی معلومات اور تاثرات کو قلمبند کر سکتے ہیں! یہ مولانا آزاد کا کمال ہے کہ انھوں نے ان پرندوں کو حیاتِ جاوداں بخش دی ہے۔ موتی اور قلندر اور ملا جیتے جاگتے کردار ہیں، اور ان کی شخصیت عام گوریاؤں اور چڑوں کی بھیڑ سے کئی گنا نمایاں ہو گئی ہے۔ اور یہ بات صرف پرندوں ہی سے متعلق نہیں ہے، یہ

تصویر کشی اور مواقع پر بھی ملتی ہے؛ مثلاً باغ میں پھول لگائے ہیں۔ ان زندانیوں نے دن رات کی محنت سے چمن تیار کیا؛ کچھ دن بعد اس میں رنگارنگ کے پھول اپنی بہار دکھانے لگے۔ یہ ہم میں سے ہر ایک کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن مولانا مرحوم کے لیے یہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ چیز ہے۔ وہ ان پھولوں کی ابتدا اور نشوونما، ان کی شکل و صورت، حسن و جمال، دلفریبی اور دلکشی وغیرہ سے متعلق ایسی تفصیل سے لکھتے ہیں کہ چشم تصور کے سامنے ایک ہر ابھرا باغ لہلہانے لگتا ہے۔

اور پھر ان سب سے بڑھ کر قابل ذکر بات یہ ہے کہ معمولی سفر کا بیان ہو کہ پرندوں کا کسی جنگ کا ذکر ہو کہ علم موسیقی کا، وہ اسے پند و معنویت اور دائمی صداقتوں اور ابدی اقدار سے الگ کر کے دیکھ نہیں سکتے؛ وہ اسے فوراً کسی کلمے کی شکل دے دیتے اور فطرت کے عالمگیر قوانین کے بالمقابل دیکھنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب ان لوگوں کو بمبئی سے گرفتار کر کے احمد نگر لے گئے ہیں، تو یہ وہاں کے ریلوے اسٹیشن سے قلعے تک موٹر کاروں میں گئے تھے۔ لکھتے ہیں: "اسٹیشن سے قلعے تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے، راہ میں کوئی موٹر نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے؛ جب قدم اٹھا دیا، تو پھر کوئی موٹر نہیں" (ص ۲۰-۲۸) اسی سفر کا بیان ہو رہا ہے۔ سڑک پر موٹر کار پوری تیزی کے ساتھ مسافت طے کر رہی ہے۔ قلعہ جو پہلے سناصلے پر دکھائی دے رہا تھا، اب قریب نظر آنے لگا۔ چشم زدن میں یہ چند قدم کا فاصلہ بھی پورا ہو گیا اور موٹر کاریں صدر پچھاہک کے اندر داخل ہو گئیں۔ فرماتے ہیں: "غور کیجئے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے۔ خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا" (ص ۲۸) بالآخر زندانیوں کا یہ قافلہ قلعے کے اندر داخل ہو گیا اور پچھاہک بند کر دیا گیا۔ یہ روزمرہ کا معمولی وقوعہ ہے، اور کوئی اس پر دھیان بھی نہیں دیتا۔ لیکن پچھاہک کے بند ہونے کی آواز سنتے ہی ان کا ذہن کہیں اور پہنچ گیا اور یہ سوچنے لگے: "اس کا رخا، ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں، تاکہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں، تاکہ کھلیں۔"

(ص ۱۹)

جب پھلی عدی کے شروع میں روسیوں نے بخارا پر حملہ کیا، تو امیر بخارا نے حکم دیا تھا کہ روہلا کے

لیے مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان کا ورد کیا جائے۔ ادھر روسیوں نے قلعہ شکن توپوں سے گولے برسانا شروع کر دیے اور آخر کار بخارا فتح ہو گیا لکھتے ہیں: "بالآخر وہی نتیجہ نکلا، جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا، جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو، دوسری طرف ختم خواجگان۔ دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں، مگر انھیں کو فائدہ پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تودہ ترک عمل کا حیلہ بن جاتی ہیں" (ص ۱۴۹)

چڑیا کا بچہ جو ابھی ابھی گھونسے سے نکلا ہے، ہنوز اڑنا نہیں جانتا اور ڈرتا ہے، ماں کی متواتر اکساہٹ کے باوجود اسے اڑنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک دن اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اڑتا اور فضا سے ناپید اکسار میں غائب ہو جاتا ہے۔ پہلی ہچکچاہٹ اور بے بسی کے مقابلے میں اس کی یہ چستی اور آسمان پیمائی حیرتناک ہے۔ اسی طرح کا ایک منظر دیکھ کر لکھتے ہیں: "جوہی اس کی سوں ہوئی خود شناسی جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرنان حاصل ہو گیا کہ "میں اڑنے والا پرند ہوں" اچانک قالب بیجان کی ہر چیز از سر نو جاندار بن گئی۔ پھر اسی سے یہ حکیمانہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں: "بے طاقتی سے تو انسانی، غفلت سے بیداری، بے پرواہی سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن کے اندر ہو گیا۔ غور کیجئے تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانے کا خلاصہ ہے" (ص ۲۳۲)

غرض پوری کتاب میں اس طرح کے جواہر ریزے منتشر پڑے ہیں، اور یہ ان کی عام روش ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر منکر ہیں جیسا کہ انھوں نے خود کسی جگہ لکھا ہے، جو کچھ اسلاف چھوڑ گئے تھے، وہ انھوں نے ورثے میں پایا اور اس کے حصول اور محفوظ رکھنے میں انھوں نے کوتاہی نہیں کی، اور جدید کی تلاش اور جستجو کے لیے انھوں نے اپنی راہ خود بنالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ذات علوم قدیمہ و جدیدہ کا سنگم بن گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ ان پر غور و فکر کے دروازے کھل جاتے اور وہ ان راہوں سے ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے، اور یہی ہوا۔ یہ اقوال جو گویا ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے اور انسانی تاریخ اور تجربے کا پختہ ہیں، اسی قرآن السعیدین کا نتیجہ ہیں۔

(۳)

مولانا آزاد مکہ (حجاز) میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ایک عرب خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ظاہر ہے کہ گھر میں بات چیت عربی میں ہوتی ہوگی جو گویا ان کی مادری زبان تھی۔ جب تک خاندان حجاز میں مقیم رہا، وہاں اردو کی باقاعدہ تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ گھر میں والد سے گفتگو اردو میں ہوتی تھی اور جو ہندستانی استاد ان کے پڑھانے کو مقرر کئے گئے تھے، ان سے بھی۔ لیکن قدرتی طور پر ابتدا میں ان کے اردو سیکھنے کا کوئی اطمینان بخش انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کے والد خاندان سمیت آخری مرتبہ ۱۸۹۸ء میں حجاز سے ہندستان آئے، تو اس وقت مولانا آزاد کو جن کی عمر کم و بیش دس سال کی تھی، اردو کی بہت کم واقفیت تھی؛ مزید برآں اردو کے غلط الفاظ اور غلط مخارج جو مکہ میں عرب بولتے ہیں، ان کی زبان پر بھی رائج تھے، جنہیں انہوں نے بتدریج کوشش کر کے دور کیا۔ چونکہ حجاز سے واپسی پر ہندستان میں بھی خاندان کا قیام کلکتہ میں رہا، جو اردو کا علاقہ نہیں اور اردو مراکز سے بھی دور ہے؛ اس پر تعلیم بھی سراسر عربی اور فارسی کی رہی، اس لیے اس دوران میں بھی اردو میں ترقی کے امکانات کم تھے۔ اس کے بعد اگرچہ مشق اور مزاولت اور محنت سے انہیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہو گئی لیکن ان کے تلفظ میں کہیں کہیں غرابت اور قدامت کے اثرات آخر تک قائم رہے۔ مثلاً وہ سوچنا کی جگہ سوچنا اباغناذ نون غنہ لکھتے ہیں (بولتے بھی اسی طرح تھے)؛ تمام مشتقات میں بھی وہ اس نون کا اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً سوچتا (ص ۲۰، ۲۸، ۳۲، ۸۲، ۲۳۶) سوچنے (ص ۲۰، ۲۲، ۲۴) سوچتا ہوں (ص ۲۴۵) سوچنا (ص ۱۰۹، ۱۶۵)؛ سوچیں (ص ۱۱۳) سوچ (ص ۱۰۹، ۱۸۲)۔ اس طرح ایک اور مصدر ڈھونڈنا ہے۔ اس کی قدیم شکل ایک باب ہوز کے اضافے کے ساتھ ڈھونڈھنا تھی۔ مرحوم اسی طرح لکھتے تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں آپ کو قدیم قدیم پر اس کی مثالیں ملیں گی؛ ڈھونڈھنا (ص ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۲۰) ڈھونڈھنے (ص ۱۰۰) ڈھونڈھنا (ص ۱۰۲) ڈھونڈھیں (ص ۹۰، ۲۶۶) ڈھونڈھیں (ص ۱۶۹) ڈھونڈھتے (ص ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴) ڈھونڈھتی (ص ۱۰۱) ڈھونڈھوایا (ص ۱۸۰) ڈھونڈھو (ص ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵

پہلے گھانس بولتے اور لکھتے تھے۔ اب گھانس متروک ہے اور گھاس ہی فصیح ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایک جگہ گھانس بھی آیا ہے (ص ۲۴۶)۔ بعض لفظوں کے دو دراملا بھی ملتے ہیں مثلاً پاؤں اور پانوں (ص ۹۶، ۸۲) اگرچہ میرالکمان ہے کہ انھوں نے پانوں ہی لکھا ہوگا، پاؤں کا تب کا تصرف ہے۔ ابتدا میں اعراب بالحرکات عام تھا؛ الفاظ میں پیش کی جگہ واؤ، زبر کی جگہ الف اور زیر کی جگہ یاء لکھتے تھے۔ یہ دراصل ترکی زبان کی تقلید کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۲۲ء تک، جب اتاترک نے ترکی کے لیے رومن رسم الخط اختیار کیا، یہ زبان بھی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور اس میں اعراب کی جگہ حروف ہی استعمال ہوتے تھے۔ بتدریج یہ رواج کم ہوتا گیا اور بالآخر بالکل ترک ہو گیا۔ مولانا نے ان خطوں میں کم از کم تین لفظوں میں پرانے رواج کا نتیجہ کیا ہے۔ انڈیل کی جگہ اونڈیل (۱۰۶، ۱۰۷) اونڈیلی (ص ۱۰۶) اور پرانی کی جگہ پورانی (ص ۲۴۱) اگرچہ ایک جگہ پرانی بھی لکھا ہے (ص ۳۰)؛ اور اونچھن (ص ۲۵۳)۔

کسی زندہ زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ نہ صرف خود اس میں تخلیق و تشکیل کا عمل جاری رہتا ہے بلکہ وہ ہمیشہ طوعاً بھی دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر اپنا خزانہ معمور کرتی رہتی ہے! اسے ضرورت کے مطابق غیر زبانوں سے الفاظ لینے میں عار نہیں ہوتی۔ اُردو تو اس معاملے میں ہے بھی معذور اور حق بجانب کیونکہ اس کا خمیر ہی متعدد ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے اختلاط سے اٹھا تھا۔ ہم نے ہر دنی زبانوں میں سے فارسی اور فارسی ہی کے واسطے سے عربی اور ترکی، اور سب سے آخر انگریزی سے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔ انگریزی الفاظ اُس دور کی یادگار ہیں، جب انگلستان کا سیاسی غلبہ اس ملک پر مستقل ہو گیا۔ اکاؤنٹ لفظ تو ہمیشہ آتا ہی رہتا ہے اور اسے آنا بھی چاہیے۔ لیکن چونکہ انگریزی کے ساتھ غیر ملکی اقتدار بھی وابستہ تھا، اس لیے غیر شعوری طور پر انگریزی لفظوں کے ساتھ کچھ ناپسندیدگی اور کراہت کا احساس ضرور رہا۔ اس کے باوجود ان لفظوں کا آنا ناگزیر تھا۔ یہ الفاظ دو حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ اول ان چیزوں کے نام جو انگریزوں کے ساتھ آئی اور پہلے سے ہمارے ہاں موجود نہیں تھیں، یا ان نئے علوم کی اصطلاحات جو مغرب میں وجود میں آئے اور یہاں ان کی تعلیم انگریزی زمانے میں شروع ہوئی۔ ہم علمی

اصطلاحات کو جوں کا توں لینے پر کسی حد تک مجبور تھے۔ لیکن یہ بات پہلی قسم سے متعلق نہیں کہی جاسکتی۔ ان سے ملتی جلتی چیزیں ہمارے یہاں موجود تھیں؛ ان کا آسانی سے عام فہم ترجمہ کیا جاسکتا تھا۔ ستم یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے اپنی تحریروں میں اندھا دھند انگریزی الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیے، حال آنکہ اس کی کسی عنوان ضرورت نہیں تھی؛ اور لطیفہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا سرسید اور ان کے دوستوں سے ہوئی جو یا تو انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، یا بہت تھوڑی جانتے تھے۔ سرسید کی اپنی تحریروں میں انگریزی کے بہت لفظ ہیں؛ رہی سہی کمی ان کے مقلدین میں ڈپٹی نذیر احمد اور حالی اور شبلی نے پوری کر دی۔ انہوں نے غیر ضروری طور پر انگریزی کے ایسے لفظ بھی اپنی تحریروں میں استعمال کیے ہیں جن کے لیے ان کے پاس کوئی عذر نہیں تھا۔ مولانا آزاد نے ان خطوط میں انگریزی کے بہت لفظ لکھے ہیں۔ ان میں بہت سے پہلی قسم میں شامل ہیں مثلاً موٹر کار (۱۰) اسٹیشن (۱۳) ٹرین (۱۲) ٹائم پیس (۱۳۲) سگریٹ کیس (۱۶، ۱۷) وارنٹ (۱۶) سول سرجن (۵۲) وغیرہ۔ یہ تمام الفاظ اب عام طور پر اردو میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں اور انہیں زبان سے خارج کر کے ہم کوئی دانشمندی کا ثبوت نہیں دینگے۔ لیکن بعض جگہ ان کے قلم سے کچھ ایسے لفظ بھی نکل گئے ہیں جن کے مراد ہمارے ہاں ملتے ہیں۔ مثلاً پریس (۹) آفس (۵) پریسیڈنٹ (۲۱) میس (۸۷، ۱۹۵) ٹیبل (۱۳، ۱۶، ۲۲) وغیرہ ہیں۔ ان کا مفہوم آسانی سے ہم اپنے موجودہ ذمیرہ الفاظ سے ادا کر سکتے ہیں اور ہمیں قطعی ضرورت نہیں کہ ہم تو ابھی نچو ابھی ان سے اپنی تحریروں کو بوجھل بنائیں۔

زبان کی طرح مصنف کا اسلوب بیان بھی بدلتا رہتا ہے اور بعض حالتوں میں تو یہ اس کے کردار کا آئینہ بن جاتا ہے۔ مولانا کی تعلیم خالص مشرقی انداز پر ہوئی۔ قدرتی طور پر مدتوں ان کا مطالعہ بھی زیادہ تر دینی علوم کا یا عربی فارسی کا رہا۔ لیکن جب انہوں نے انگریزی میں کافی مہارت پیدا کر لی تو اس کے بعد انہوں نے مغربی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے انگریزی کتابیں بھی کثرت سے پڑھیں۔ اس کا اثر ان کی طرز تحریر پر پڑنا ہی چاہیے تھا۔ اب وہ غیر شعوری طور پر انگریزی روزمرہ کا متبع کرتے ہیں بلکہ کہیں کہیں تو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ وہ انگریزی میں

سوچ رہے اور اس کے محاوروں، جملوں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ "خبرِ خاطر" میں بھی اس کی مثالیں کچھ کم نہیں۔ مثلاً صبح مسکرا رہی تھی (۶۹، ۲۲)؛ یہ اس دورِ صبحی کا آخری جام ہوتا ہے (۵۴)، مشتولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں (۷۲)، آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی (۷۲) یہ خیال بس کرتا ہے (۷۷) میرے اختیار کی پسند نہیں تھی (۸۳) حالات کی مخلوق (۹۳) اگر دو پیش کے موثرات (۹۳)۔ یہ سب جملے اور ترکیبیں اپنی ساخت میں بنیادی طور پر انگریزی کی ہیں۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے ایام میں عام طور پر انگریزی کتا میں ان کے مطالعے میں رہیں، وہی ترکیبیں ان کے ذہن میں بسی ہوئی تھیں، اور جب وہ یہ خطوط لکھ رہے تھے، لامحالہ تحت الشور سے ابھر کر انہوں نے اردو کا جامہ پہن لیا۔

(۴)

خبرِ خاطر پہلی مرتبہ مئی ۱۹۲۶ء میں چھپی تھی۔ اسے جناب محمد اجل خان نے مرتب کیا تھا؛ اور اس کے شروع میں ان کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ چونکہ ایک زمانے کے بعد لوگوں نے مولانا آزاد کی کوئی تحریر دیکھی تھی، یہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ تین مہینے بعد کتاب دوسری مرتبہ اسی سال اگست میں چھپی؛ اور یہ اشاعت بھی سال بھر میں ختم ہو گئی۔ ان دونوں اشاعتوں کے ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی تھے۔ بد قسمتی سے دونوں مرتبہ کتابت کا معیاری انتظام نہیں ہو سکا تھا اور اسی لیے مولانا اس سے مطمئن نہیں تھے۔ تیسری مرتبہ اسے ان کے ایک دیرینہ مداح لالہ پنڈی داس نے ۱۹۴۷ء کے فروری میں لاہور سے شائع کیا۔ اس مرتبہ اس میں ایک خط بھی زائد تھا جو پہلی دونوں اشاعتوں میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا؛ یہ سب

لالہ پنڈی داس کا پنجاب کے پرانے انقلابیوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ لاہور کی اولین انقلابی انجمن "بھارت ماتا سبھا" کے ممبر، بلکہ اس کے بانیوں میں سے تھے۔ اس انجمن میں سردار اجیت سنگھ (بھگت سنگھ کے چچا، صوفی انبا پرشاد) ایڈیٹر روزنامہ پیشوا، ایشری پرشاد (نیم سوپ والے) منشی نور خان ساغر اکبر آبادی، دینا ناتھ حافظ آبادی (ایڈیٹر اخبار ہندوستان) لال چند فلک، مہتہ نند کشور وغیرہ ان کے شریک کار تھے۔ انجمن کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ بھی نکلتا تھا۔ (پنڈی داس خود بھی ایک پرچہ "انڈیا" گوجرانوالہ سے (باقی اگلے صفحے پر)

آخری خط موسیقی سے متعلق ہے۔ اب بازار میں اسی تیسری اشاعت کے چوری چھپے کے نقلی نسخے ملتے ہیں؛ اور یہ کتابت کی اغلاط سے پُر ہیں۔

مولانا آزاد مرحوم کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) کے بعد ساہتیہ اکادمی نے فیصلہ کیا کہ ان کی تمام تحریروں کو جمع کر کے جدید طریقے پر مرتب کیا جائے۔ کام کا آغاز ان کی شاہکار تصنیف ترجمان القرآن سے کیا گیا۔ کتاب کی مولانا آزاد کی زندگی میں دو جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ ساہتیہ اکادمی نے انھیں چار جلدوں میں تقسیم کر دیا۔

غبارِ خاطر کی ترتیب میں مجھے سب سے زیادہ وقت مختلف کتابوں اور اشعار کے حوالوں کی تلاش میں ہونی۔ مرحوم لکھتے وقت اپنے حلقے سے بیتکلف کتابوں کی عبارتیں اور شعر لکھتے چلے جاتے تھے۔ جہاں تک معروف شعر اور مطبوعہ دواوین کا تعلق ہے ان سے رجوع کرنا چنداں دشوار نہیں تھا۔ لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے شعر کسی تذکرے میں دیکھا تھا یا کہیں اور میں نے حوالے دواوین سے دیے ہیں۔ آپ دیکھینگے کہ بہت جگہ لفظی تفاوت ہے۔ بعض اوقات وہ موقع کی ضرورت سے دانستہ بھی ردوبدل کر لیتے ہیں لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے جہاں اسے دیکھا تھا وہاں یہ اسی طرح چھپا ہوا ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ان کے حافظے نے اسے جوں کاتوں محفوظ نہ رکھا ہو۔ اس صورت میں انہوں نے اس میں ایک آدھ لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے لکھ دیا۔ چونکہ خود موزوں طبع تھے۔ شعر ساقط الوزن تو ہو نہیں سکتا تھا، البتہ اصل متن قائم نہ رہا۔

(۵)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کتابت سے متعلق بعض باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔

۱۔ سلسلہ گذشتہ نکالتے تھے۔ اس سبھا کے جلسے باقاعدہ ہوتے جن میں جو شیخ اراکین حکومت سے نسبت نہ رکھتے تھے انہیں انہار کرنے اور لوگوں کو ابھارنے کے لیے نظم و نثر میں آگ اگلے تھے۔

جب مئی ۱۹۰۰ء میں حکومت نے لالہ لاجپت رائے کو گرفتار کر کے ماندے اور ماہ میں نظر بند کر دیا تو اسی زمانے میں ہندی داس اور نند کشر کو بھی پانچ سال کے لیے کسی نامعلوم مقام پر بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۴ جولائی ۱۹۶۵ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔

اردو میں متعدد لفظوں کے لکھنے میں بہت بے احتیاطی کا رواج سا ہو گیا ہے۔ مثلاً عام طور پر فارسی کے حاصل مصدر ہمزہ سے لکھے جاتے ہیں۔ جیسے آزمائش، ستائش، افزائش وغیرہ۔ یہاں ہمزہ غلط ہے، یہ تمام الفاظ یاے سے ہونا چاہئیں۔ یعنی آزمائش، ستائش، افزائش وغیرہ۔ اسی طرح فارسی مرکبات تو صیغی و اضافی ہیں اگر موصوف یا مضاف کے آخر میں یاے ہو، تو اس پر ہمزہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر صلاے عام، پاسے خود، جاے مہان میں کسی جگہ بھی یاے پر ہمزہ لکھنا درست نہیں۔ ہاں، اگر یہ یاے معروف ہو، تو اس صورت میں اس کے نیچے زیر لگانا چاہیے مثلاً رعنائی خیال، بیماری دل وغیرہ۔

اردو کے وہ لفظ جو امر تعظیمی کی ذیل میں آتے ہیں جیسے کیجیے، بیجیے، ڈریے یا جمع ماضی کے صیغے مثلاً دیے، لیے وغیرہ، ان میں بھی ہمزہ نہیں، بلکہ آخر میں یاے ہے، یہی حال چاہیے کا ہے۔ ہمارے ہاں تحریر میں رموز اوقاف کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ بعض اوقات اس سے بہت الجھن پیدا ہو جاتی ہے اور عبارت کے معنی تک بدل جاتے ہیں۔ آپ کو انگریزی کی کوئی معیاری کتاب رموز اوقاف کے بغیر نہیں ملیگی۔ یہ قابل تقلید روش ہے۔ ہمارے لکھنے والوں اور ناشرین کو اس پر کاربند ہونے کی ضرورت ہے۔ اردو میں چونکہ اس کا رواج نہیں، اس لیے یہ فیصلہ کرنا بھی دشوار ہے کہ کہاں کونسا نشان رکھنا چاہیے۔ اگر یہ استعمال عام ہو جائے، تو رفتہ رفتہ یہ تعین بھی ہو جائیگی۔

تذکرہ

”الہلال“ کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا، جب مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر ۲۴ سال سے بھی کم تھی۔ یہ محض ایک ہفتہ وار جریدہ نہیں تھا، بلکہ ایک دعوت تھی — مذہبی، سیاسی، ادبی۔ جس تیزی سے اس نے ان میں سے ہر ایک میدان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی، وہ حیرتناک تھی اور آج تک بی نظیر بھی ہے۔ سیاسی میدان میں یہ پہلی آواز تھی، جو علی گڑھ اسکول کی کانگریس دشمنی اور انگریز دوستی کے خلاف بلند ہوئی، اس سے پہلے کس کو اس کی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ سرسید کی پالیسی کو جو ۱۹۰۵ء کے غیر معمولی حالات کا نتیجہ تھی، کھلم کھلا تقویم پارینہ کہہ کر اسے ترک کر دینے کی تلقین کرتا۔ الہلال نے پوری جرأت اور قوت سے اس طریقہ کار کی فرسودگی اور بے مقصدیت کو بینقاب کرنا شروع کیا۔ الہلال کی اس تعلیم کی تیز توجہ جہاں کام کر رہا تھا اور اس سے جو خطرناک نتائج پیدا ہو سکتے تھے، حکومت وقت بھی اس سے بیخبر نہیں تھی، لیکن چونکہ یہ ساری تعلیم دینی لباس میں پیش کی جا رہی تھی، وہ اس کے جواں سال مدیر کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے ہچکچاتی تھی، لیکن تاکہ بالآخر حکومت نے ستمبر ۱۹۱۳ء میں حادثہ مسجد کانپور کے ہنگامے کے زمانے میں ایک نمونہ پر الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کر لی، جو فوراً پیش کر دی گئی۔

اگلے ہی برس یعنی اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ اب الہلال کے تیز دماغ

مضامین حکومت کی نظر میں باغیانہ ٹھہرے۔ اخبار پانیرا آباد نے، جو اس عہد میں گویا انگریزی حکمت عملی کا نفسِ ناطقہ تھا، حکومت کو توجہ دلائی کہ الہلال در پر وہ جرمنی کا حامی ہے، اور حکومت اس کے مخالفانہ رویے سے چشم پوشی یا سہل انگاری کر کے دانشمندی کا ثبوت نہیں دے رہی ہے۔ ممکن نہیں تھا کہ حکومت، پانیرا کی اس تنبیہ کو نظر انداز کر دیتی۔ اس کے دو ہفتے بعد نومبر ۱۹۱۴ء میں حکومت نے الہلال کی دو ہزار کی ضمانت ضبط کر لی۔ اس پر مولانا آزاد نے اخبار بند کر دیا۔ آخری پرچے پر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کی تاریخ چھپی ہے۔

ایک سال بعد نومبر ۱۹۱۵ء میں انہوں نے ایک دو ہزار پرچہ البلاغ کے نام سے جاری کیا۔ یہ صرف نام کے لحاظ سے نیا تھا، ورنہ شکل و صورت، مضامین و مواد، اسلوب و استدلال — غرض ہر بات میں یہ الہلال کا نقشِ ثانی ثابت ہوا۔ اب جنگ اپنے پورے شباب پر تھی، اور انگریز ہر محاذ پر سپاہ مور ہے تھے۔ مولانا کے اندازِ فکر و تحریر میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، بلکہ 'ذوقِ نغمہ' کی کمی نے ان کی 'نوا تیز تر' کر دی تھی۔ حکومت اخبار کی جارحانہ تحریروں سے درگزر نہ کر سکی۔ آخر کار ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے انہیں ایک ہفتے کے اندر حدود بنگال سے باہر چلے جانے کا حکم صادر کر دیا۔ اس پر انہوں نے مجبوراً رختِ سفر باندھا۔ وہ ۳۰ مارچ کو کلکتہ سے نکلے۔ روانگی سے پہلے وہ البلاغ کا وہ پرچہ مرتب کر چکے تھے، جس پر ۳ اپریل ۱۹۱۶ء کی تاریخ ثبت ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی کلکتہ سے غیر حاضری سے پرچے کی اشاعت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن ان کا خیال غلط ثابت ہوا؛ اس کے جاری رکھنے کے لیے ان کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں۔ پرچہ اس کے بعد جاری نہ رہ سکا؛ اور یہی ۳ اپریل کا پرچہ آخری شمارہ ثابت ہوا۔

چونکہ پنجاب، یوپی وغیرہ کی حکومتیں پہلے ہی ان کا اپنے ہاں داخلہ ممنوع قرار دے چکی تھیں، اس لیے بنگال سے نکل کر اب انہیں بہار میں رانچی کے باہر ایک گاؤں مور آبادی میں پناہ لینا پڑی۔ تین ماہ بعد ۷ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت نے وہیں رانچی میں ان کی نظر بندی کے احکام جاری کر دیے۔

الہلال اور اس کے بعد البلاغ کے مہتمم ایک صاحب فضل الدین احمد مرزا تھے؛ جب بعد کو مولانا آزاد نے مولانا عبدالرزاق ملج آبادی کی مدد سے پیغام جاری کیا تو اس کے منیجر بھی وہی مقرر ہوئے۔ وہ ضلع گورداسپور (پنجاب) کے ایک دیہات کے رہنے والے تھے! انھوں نے جاپان میں انجنیری کی تعلیم پائی تھی۔ جب وہاں سے لوٹے تو کلکتے چلے گئے، جہاں ان کے بھائی پہلے سے غالباً انجنیرنگ ہی کے محکمے میں ملازم تھے۔ یہ ۱۹۰۲ء کی بات ہے، جب مولانا آزاد ہنوز تعلیم سے بھی فارغ نہیں ہوئے تھے۔ دونوں کی ملاقات ہوئی اور رفتہ رفتہ اس نے دوستی کی شکل اختیار کر لی جس میں زمانے کے ساتھ استواری پیدا ہو گئی۔ جب مولانا آزاد رانچی میں منظر بند ہوئے، تو فضل الدین احمد مرزا نے باصرار انھیں اپنی سرگزشت لکھنے پر رضامند کر لیا۔

مولانا نے جب لکھنا شروع کیا، تو ابتدا اپنے بزرگوں کے حالات سے کی۔ مسودہ خاصاً ضخیم ہو گیا۔ اسے مناسب حدود میں رکھنے کی خاطر فضل الدین احمد مرزا نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، پہلا حصہ بعد کو تذکرہ کے عنوان سے ۱۹۱۹ء کے آخر میں شائع ہوا۔ اس میں مولانا آزاد نے اپنے پردادا شاہ محمد افضل کے مادری سلسلے کے ایک بزرگ حضرت شیخ جمال الدین دہلوی کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ یہ دراصل پوری کتاب کا پہلا باب ہے، جو سرتاسر حضرت شیخ جمال الدین کے حالات پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں، جو شائع نہ ہو سکا، شیخ جمال الدین کے بیٹے شیخ محمد کے حالات تھے۔ تیسرے باب میں ان کے پردادا شاہ محمد افضل کے اور والد مولانا محمد خیر الدین کے نانا مولانا منور الدین کے سوانح حیات تھے! ان کے علاوہ مسودے کے کئی طویل حواشی بھی انھوں نے روک لیے تھے، یہ سارا مواد وہ دوسرے حصے میں شائع کرنے والے

۱۔ فضل الدین احمد مرزا صاحب سے متعلق جو تفصیلات دی گئی ہیں، یہ مولانا عبدالرزاق ملج آبادی کی کتاب 'ذکر آزاد' (۱۰۹-۱۱۰) اور مولانا غلام رسول مہ کے ایک خط پر مبنی ہیں۔

۲۔ دیکھئے تذکرہ: فضل الدین احمد مرزا کا نٹ، ص ۳۰۸-۳۰۹، ساہتیہ اکادمی انڈیا، ۱۹۵۵ء

۳۔ ایضاً مقدمہ: ۲۲

تھے۔ لیکن حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ وہ مولانا کی رہائی سے پہلے ہی کلکتہ چھوڑ کر پنجاب چلے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ لدھیانہ میونسپل کمیٹی میں سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ جب ترک موالات کی تحریک نے زور پکڑا، تو وہ بھی ملازمت ترک کر کے اپنے وطن چلے گئے، جہاں غالباً ۱۹۲۲ء میں ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ مولانا آزاد نے اپنی زندگی میں بقیہ مسودہ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی؛ ایک خاص آدمی تک مرزا صاحب مرحوم کے مکان پر بھیجا کہ ان کے لواحقین اور پسماندگان سے اس کا کھوج نکالے، لیکن بیسودا، یہ دستیاب نہ ہوا۔

مولانا آزاد کو اس کتاب کی تصنیف میں زیادہ دن نہیں لگے تھے۔ جیسا کہ خود فضل الدین احمد مرزا صاحب نے لکھا ہے^۱۔ یہ جون ۱۹۱۶ء سے ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۶ء تک کے درمیانی پانچ مہینے میں قلمبند ہوئی۔

یہی نہیں، مولانا نے اس کتاب میں اپنی کچھ مزید تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً

۱ 'حقیقت ایمان و کفر و نفاق' پر ایک رسالہ^۵

[اس کا امکان ہے کہ یہ رسالہ تذکرہ سے پہلے لکھا جا چکا تھا]

۲ سیرۃ نبویہ ماخوذہ من القرآن^۶

[یہ ۱۹۱۴ء سے پہلے کی تصنیف تھی]

۳ تحصیل السعادتین^۷

[یہ رسالہ بھی غالباً پہلے سے لکھا ہوا موجود تھا۔ اس میں یونانی اور عجمی

فلسفے کی اسلامی علوم میں ملاوٹ اور اس کے خطرناک اور افسوسناک

نتائج کا بیان تھا]

۵۔ ایضاً (متن) : ۱۸۹ (حاشیہ)

۴۔ ایضاً: (مقدمہ) : ۱۸

۶۔ ایضاً: (متن) : ۲۰۵

۷۔ ایضاً: ۲۱۷ (حاشیہ)

- ۴ سیرۃ امام احمد بن حنبلؒ
- ۵ شرح نامہ وصیت امام احمد بن حنبلؒ
- [۴ و ۵: یہ دونوں البلاغ میں اشاعت کے لیے لکھنا شروع کی تھیں۔
لیکن تکمیل سے پہلے کلکتہ سے اخراج کا حکم نافذ ہو گیا اور البلاغ بھی
بند ہو گیا! غالباً یہ مکمل نہ ہو سکیں]
- ۶ مقدمہ تفسیر^۹
- [یہ بھی تذکرہ سے پہلے مکمل ہو چکی تھی]
- ۷ رسالہ آفات الخلف^{۱۰}
- [یہ بھی پہلے کی تصنیف ہے۔ اس میں ہستی باری تعالیٰ سے بحث کی تھی اور دکھایا تھا کہ خدا کی ذات و صفات کا ادراک عقل سے ممکن نہیں، جو ماورائے محسوسات ہے۔ مذہب اور علوم عقلیہ دونوں ہی غیر حسی چیزوں کے ادراک سے عاجز ہیں؛ ایمان بالغیب ہی سلامتی کی راہ ہے^{۱۱}]
- ۸ الکلم الطیب والقول الثابت^{۱۲}
- (پہلے کی تصنیف ہے۔ اس میں مذہب اور عقل کی باہمی آویزش پر بحث کر کے دکھلایا ہے کہ قرآن کی تعلیم کسی پہلو سے بھی عقل کے خلاف نہیں ہے۔ اس تعلیم کے دو حصے ہیں: اعمال و عقائد؛ اعمال جن کا تعلق زندگی سے ہے، وہ تو عقل کے عین مطابق ہیں۔ عقائد ماورائے مادیات اور اسی لے ماورائے عقل ہیں۔ یہ بھی ضد عقل نہیں۔ پس اسلام میں سرے سے عقل سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔)

۹۔ ایضاً: ۲۴۴

۱۰۔ ذکر آزاد، ۲۸۶ (کلکتہ ۱۹۶۰ء)

۱۱۔ ذکر آزاد: ۲۸۴

۸۔ ایضاً: ۲۱۶-۲۲۰ (حاشیہ)

۱۰۔ ایضاً: ۲۴۴

۱۲۔ تذکرہ: ۲۴۴

۹ سیرۃ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی^{۱۴}

[پہلے کی تصنیف ہے]

۱۰ سیرۃ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی^{۱۵}

[تذکرہ کی تصنیف کے دوران ہی میں قلمبند ہوئی تھی۔ اس میں متوسطاً تقطیع

کے ۱۳ صفحات تھے؛ اور اس کے لکھنے میں ایک ہفتہ صرف ہوا تھا]

۱۱ شرح حدیث غربت^{۱۶}

[حدیث بدء الاسلام غریباً وسیعود مکابدء کی تشریح و توضیح]

چونکہ "تذکرہ" کی تصنیف کے آغاز سے پہلے انہوں نے فضل الدین احمد مرزا سے وعدہ کر لیا تھا کہ اس دوران میں جو کچھ بھی لکھا جائیگا وہ انہیں کے سپرد ہوگا؛ اس لیے سیرۃ شیخ احمد سرہندی بھی انہیں کے پاس بھیج دی گئی تھی؛ اور افسوس کا مقام ہے کہ "تذکرہ" کے بقیہ مسودہ کی طرح یہ بھی ضائع ہو گئی۔

"تذکرہ" الہلالی دور کی تصنیف ہے۔ انداز اس کا بھی بالواسطہ طور پر دعوت ہی کا ہے۔ اس کی زبان بھی عربی فارسی کے الفاظ سے بوجھل ہے۔ اس میں بھی وہی بات سے بات پیدا کرنے کا رجحان، جولانی طبع، خطابت، اور دعوت و تبلیغ کا انداز ملتا ہے، جو الہلال اور البلاغ کا ماہر الامتیاز بلکہ طرہ افتخار تھا۔ بلکہ یہاں وہ نئے دو آتشہ ہو گئی ہے۔ پوری کتاب کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان اکابر کا جانشین خیال کرتے ہیں، جن کی عزیمت دعوت کو وہ دنیا کے سامنے عموماً اور مسلمانوں کے سامنے خصوصاً بطور نمونہ و اسوہ پیش کر رہے ہیں۔ تذکرہ کا غائر مطالعہ کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کے دل میں رہ رہ کر کوئی خیال کر دہیں لے رہا ہے۔ ایک مثال دیکھیے :

ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں مولانا آزاد کے جد امجد شیخ جمال الدین سے متعلق

۱۵۔ ایضاً: ۲۶۵ (حاشیہ)

۱۶۔ ایضاً: ۲۶۵ (حاشیہ)

۱۴۔ تذکرہ: ۲۴۴

۱۶۔ ایضاً: ۲۶۸ - ۲۶۹ (حاشیہ)

لکھا تھا: باہل دنیا کارے ندارد، بافادہ وافاضہ طلاب علم مشغول است (منتخب التواریخ، ۳: ۱۱۳)۔ اس پر لکھتے ہیں^{۱۸}:

یہ شہادت دیکھ کر طبیعت کو نہایت درجہ خوشی ہوئی۔ کہ نہیں سکتا کہ یہ خیال کس درجہ سرور قلب و کیفیت دماغ کا باعث ہوا کہ الحمد للہ علم حدیث و سنت کی خدمت و چاکری کی سعادت سے ہمیشہ یہ خاندان ممتاز رہا ہے۔ اور برنگِ محدثین 'ذوقِ سنت اور' باہل دنیا کا سزا داشتن کی دولت ابتدا ہی سے ہم خاک نشینانِ تقرون امرادی کے حصے میں آئی ہے۔ عجب نہیں کہ یہ بادہ کہن وقت کی خار آلود گیوں کے علی الرغم پھر جام و مینا کی گردش تک پہنچے اور یہ سرمستی پارینہ داروسے تازہ سے ترکیب پاکر ہنگامہ گزشتہ اور شورشِ رنتہ کی دست افشانیوں اور پاکو بیوں کا عالم از سر نو پھر تازہ کر دے:

بہ بدستی مزد، گر شہم سازد مراساتی
ہنوز از بادہ پارینہ ام پیمانہ بودارد

ایک اور مقام ملاحظہ ہو: عشق مجازی میں ناکامی اور اس کے سودوزیاں کی داستاں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں^{۱۹}:

زمانے کو کل تک جہاں پہنچانا چاہا تھا، الحمد للہ اب خود اس سے بھی منزلوں آگے بڑھ چکے ہیں؛ اور گو ہم ہاں راہ اب تک اسی منزل میں کمر بن کھولے بیفکر پڑے ہیں، مگر اپنا کاروان طلب اب کسی دوسری ہی منزل کے آثار سامنے دیکھ رہا ہے۔

مے کہ فی رود امروز در گلوک دو کون
کینہ جرمہ تہ شیشہ باسے دوشِ فرست

۱۹۔ تذکرہ : ۳۳۵

۱۸۔ دیکھیے تذکرہ : ۲۰۲

یہ سطرین پڑھنے سے معاً خیال ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص دعویٰ کرنے کو پر تول رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو اس کی بنیاد دراصل ۱۹۱۳ء میں پڑی، جب انھوں نے 'حزب اللہ' کی بنیاد رکھی تھی؛ اور یہ اسی کا قدرتی نتیجہ تھا کہ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے اپنی امامت پر بیعت لینے کے لیے مختلف صوبوں میں داعی مقرر کر دیے۔^{۲۱} معاملہ خاصاً آگے بڑھ چکا تھا؛ لیکن ان کی فراست اور دور اندیشی کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ اس پر خار راہ سے دامن بچا کر نکل گئے۔ اگر خدا نخواستہ وہ اس آزمائش میں پورے زائرے ہوتے، تو نہیں معلوم ان کا کیا حشر ہوتا۔ میں اسے واقعی ان کی کرامت خیال کرتا ہوں کہ وہ اس حد تک جانے کے بعد بھی صحیح سلامت واپس آ گئے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم نے لکھا تھا:^{۲۲}
اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مولانا خود اس سے دشمنی نہیں ہوئے تھے، بلکہ علمائے دیوبند کی سخت مخالفت کے باعث۔ دہلی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں مولانا کی امامت کا رزلویشن منظور نہ ہو سکا تھا۔ مولانا کو طبعی طور پر اس کا بڑا صدمہ تھا۔ اور غالباً اسی بددلی اور بیزاری کا اثر تھا کہ انھوں نے اپنا راستہ بدل لیا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم نے علمائے دیوبند کی مخالفت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ یقیناً صحیح ہوگا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے متاثر ہو کر مولانا آزاد نے اپنا راستہ بدل دیا۔ "مولانا اکبر آبادی کو غلط نہیں ہوئی۔ اور یہ ان کے مولانا آزاد کے کردار کی افتاد کے نہ سمجھنے پر دال ہے۔ مولانا آزاد نے اپنا راستہ کبھی نہیں بدلا۔ انھوں نے روزِ اول امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل کرنے اور قرآن و سنت کی دعوت کی اشاعت کو اپنا

۲۰۔ حزب اللہ کی تاسیس کا ذکر سب سے اول الہلال کے دسمبر ۱۹۱۳ء کے شماروں میں ہے۔ کچھ تفصیلات ۱۹۱۴ء کے شماروں میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

۲۱۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: ذکر آزاد: ۲۳-۲۴

۲۲۔ ماہنامہ برہان، دلی ستمبر ۱۹۶۸ء

نصب العین قرار دیا تھا۔ اور پھر عمر بھر وہ اسی رستے پر چلتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے نہ کبھی پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا، نہ دائیں بائیں کی کوئی اور کشش اور ترغیب انھیں اس راہ سے ہٹا سکی۔ اپنی زندگی میں انھوں نے جو کچھ کیا، اسی مقصد کے حصول کے لیے کیا۔ افسوس کہ اس موضوع پر کسی تفصیل سے لکھنے کا یہ موقع نہیں، ورنہ امثال و شواہد سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جو مقصد حیات اپنے سامنے ۱۹۰۳ء میں رکھا تھا، اپنی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) تک وہ پوری ثابت قدمی سے اسی پر قائم رہے۔

لیکن مولانا اکبر آبادی کا یہ کہنا کہ مولانا آزاد امامت کے دعوے سے خوددشکس نہیں ہوئے تھے، بلکہ علماء دیوبند کی سخت مخالفت کے باعث، تو اسے ایک اور پہلو سے دیکھیے۔

یہ ثابت ہے کہ مولانا آزاد نے مختلف صوبوں میں اپنی امامت پر بیعت لینے کا کام شروع کر دیا تھا۔ جب انھوں نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو یوپی میں بیعت لینے کی اجازت دی، اور انھیں بتایا کہ بیعت کا کام دوسرے صوبوں میں جاری ہو چکا ہے، جسے دوسرے لوگ کر رہے ہیں؛ یوپی کا صوبہ تم اپنے ذمے لے لو۔ گویا کم از کم شمالی ہند میں لوگوں کی ایک "معقول تعداد" ان کی امامت پر متفق ہو چکی تھی۔ اگر وہ چاہتے، تو علماء دیوبند کی سخت مخالفت کے باوجود ان مباہیین کے بل بوتے پر باسانی اپنی امامت کا اعلان کر سکتے تھے۔ آخر آج جو ہیشمار فرقے ملتے ہیں، یہ کس طرح وجود میں آئے۔ اور ان کے متبعین کی تعداد کتنی ہے! لیکن ایسا کرنا مولانا آزاد کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ امامت میں تغزب اور گروہ بندی کے خلاف تھے۔ ان کا اصول "وصل" تھا، نہ کہ "فصل"۔ اسی لیے انھوں نے نفسِ امارہ کی نہیں سنی، اور اس دعوے سے دست بردار ہو گئے۔ اسی لیے میں نے کہا کہ اس حد تک کامیابی کر لینے کے بعد بھی ان کا یہ اقدام کسی طرح کرامت سے کم نہیں تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اور غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا جائے۔

فضل الدین احمد صاحب نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے: ۲۴

ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے، اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں، تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بخودی" فی الحقیقت الہلال ہی کی مداسے بازگشت ہیں۔

یہ بہت اوجھی بات تھی۔ قدرتاً اقبال مرحوم کو اسے پڑھ کر رنج ہوا؛ انھوں نے اس کی مولانا سید سلیمان ندوی سے بدیں الفاظ شکایت کی: ۲۵

مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ "آپ کی نظر سے گزرا ہوگا؛ بہت دلچسپ کتاب ہے؛ مگر دیکھا ہے میں مولوی فضل الدین احمد مرزا لکھتے ہیں: "اقبال کی مثنویاں الہلال کی بازگشت ہیں" شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں، ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر۔ انگریزی و اردو میں موجود ہیں، جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر تھیں۔ بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا؛ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے، نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال کی تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا؛ تحریک الہلال نے اسے مسلمان کر دیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے؛ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی؛ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضرور نہیں کہ اوردوں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے۔ ان میں اور مثنویوں میں زمین و

۲۴۔ تذکرہ (مقدمہ) : ۱۶

۲۵۔ دیکھے اقبال کا خط، معارف جلد ۳، شماره جون ۱۹۵۴ء : ۶۶۹

آسان کا فرق ہے۔ معلوم نہیں، انھوں نے کیا سنا، اور سنی سنائی بات پر اعتماد کر کے ایسا جملہ لکھنا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ کسی طرح ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں، مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں، ورنہ یہ موخر الذکر شکایت براہِ راست اُن سے کرتا۔ اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو، تو میری شکایت ان تک پہنچائیے۔

ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کسی عنوانِ فضل الدین احمد مرزا صاحب کی تحریر اور رائے کے لیے ذمہ دار نہیں گردانے جاسکتے، بالخصوص جب کہ کتاب کی اشاعت ہی ان کی اجازت اور اطلاع کے بغیر ہوئی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ فضل الدین احمد مرزا کا مقدمہ اس صورت میں کتاب کے ساتھ چھپے۔ اس کے باوجود جب سید سلیمان مرحوم نے انھیں ڈاکٹر اقبال کے مولانا فوق خط کی طرف توجہ دلائی، تو مولانا آزاد نے سید صاحب کو لکھا:

ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بجا نہیں۔ یہ نہایت ہی نواور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی۔ لیکن لوگوں کا پیمانہ نظر یہی باتیں ہیں، تو کیا کیا جائے۔ دراصل اس تذکرہ کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظر ثانی کے لیے بھیجا تھا، اس لیے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصہ کر کے شائع کرنا چاہتے تھے؛ اور میں ٹھہرتھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے صرف اتنا کہ درجہ ضمنی منظومات و عدم انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہوگا۔ خیال کیا کہ مقدمہ کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا، لیکن انھوں نے بجنسہ چھاپ کر جلد باندھ کر یکایک ایک نسخہ بھیج دیا؛ اور ان ساری باتوں کو وہ مزاج سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ والے لوگوں کے پورے مقدمہ طرزِ تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی باطلِ خوب ہے۔ لطف یہ کہ

اس مرتبہ جب وہ جلسہ کے موقع پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے کیونکر تبدیلی معلوم کی، تو خود میرے ہی ایک قول کا حوالہ دیا جو کبھی کہا تھا؛ حال آنکہ میں نے جو بات کہی تھی۔ وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کل کے عامۃ الناس کے تصوف میں مبتلا تھے، اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے، اور دونوں مشنویوں میں جو بات ظاہر کرنی چاہتے ہیں، وہ وہی ہے جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔

یقین ہے کہ اس خط کا اقتباس مولانا سید سلیمان مرحوم نے اقبال کے پاس بھیجا ہوگا۔ اور چونکہ اس کے بعد انہوں نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ غالباً مطمئن ہو گئے تھے۔ اس سے اتنا ثابت ہے کہ یہ دل آزار تحریر نہ مولانا آزاد کی اجازت و استصواب سے شائع ہوئی، نہ وہ اس کے لیے ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔

کچھ کرنے کے کام

تمام دوسرے لوگوں کی طرح ہم مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق بھی دو پہلوؤں سے لکھ سکتے ہیں۔ اول، ان کے سوانح حیات ہیں، جن میں ان کے خاندان کا تذکرہ اور اُس ماحول کا ذکر ہوگا جس میں ان کی پیدائش ہوئی اور انھوں نے تعلیم و تربیت کے مراحل طے کیے۔ انھیں کی روشنی میں ان کے اخلاق و عادات اور کردار کی تشکیل پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ دوسرے، ان کے کام اور کارنامے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے کن میدانوں میں کام کیا اور ان میں کس حد تک کامیابی حاصل کی؟

جہاں تک ان کے سوانح حیات کا تعلق ہے، اس بارے میں جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اور چھپ کر ہمارے سامنے آیا ہے، میرے خیال میں وہ بہت کافی ہے۔ بنیادی طور پر تمام کوائف ہمارے علم میں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ تحقیق و تجسس سے ان کی ابتدائی زندگی کی بعض جزوی تفصیلات سے متعلق کوئی نئی بات منظر عام پر آجائے، ورنہ کسی اہم واقعے کے اصراف کے امکانات اب بہت کم ہیں۔ خود مولانا آزاد اپنے بارے میں بہت کم گوئے تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے حالات تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ایک دوست کی فرمائش پر وہ اپنی سوانح عمری لکھنے پر آمادہ بھی ہوئے تو "تذکرہ" میں اپنے متعلق چند اشارے کر کے رہ گئے جو اسی زمانے میں شائع ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد عبدالرزاق طبع آبادی

مرحوم نے ان سے متعلق دو کتابیں شائع کیں۔ "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" اور "ذکر آزاد" ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور مولانا امداد صابری نے بھی ان کی سوانح عمریاں قلمبند کی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ساہتیہ اکادمی سے "سلسلہ اکابر ادب" میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی لکھی ہوئی مختصر کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد" شائع ہوئی ہے۔ پروفیسر صاحب نے اسی موضوع پر ایک مفصل کتاب بھی لکھی ہے، جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی ایک تفصیلی کتاب انگریزی میں میرے ایک اور دوست لکھ رہے ہیں۔ یہ غالباً ۱۹۸۹ء کے اواخر تک شائع ہو جائیگی۔ ایک انگریز مصنف کا لکھا ہوا انگریزی مقالہ بھی چھپ گیا ہے۔ اس سے میرا مقصود یہ ہے کہ جہاں تک ان کی سوانح عمری کا تعلق ہے، ہم اس مطبوعہ مواد پر بہت کم اضافہ کر سکتے ہیں۔

لیکن میرے نزدیک ایک پہلو ایسا ہے، جس پر بہت کم کام ہوا ہے۔ اور اسی پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سب تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نائنہ روزگار شخصیت اور ہمہ گیر صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی سرگرمیوں کے متعدد میدان تھے اور وہ ہر جگہ منفرد مقام کے حامل۔ وہ صحافی تھے، ادیب اور انا، پرواز تھے، عالم دین تھے، مفسر قرآن تھے، مفکر تھے، سیاست دان تھے، تحریک آزادی کے ممتاز سپاہی تھے، حکومت ہند کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے آزاد ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی ان گونا گونا گویا سرگرمیوں پر بہت کم لکھا گیا ہے، حال آنکہ میرے نزدیک کرنے کا یہی کام تھا۔

دعوت الہلال

مولانا آزاد اپنی خاندانی روایات اور تعلیم کے زیر اثر ایک عالم دین، ہی کی حیثیت میں ملک سے متعارف ہوئے۔ مدتوں ان کی تحریروں کا محور اسلام کی افہام و تفہیم ہی رہا۔ اور لوگوں نے انھیں اسی صورت میں جانا اور مانا۔ انھوں نے اسلام کی جو خدمات کیں، اور اسلام کی تعبیر و تفسیر اور "مسلمان را مسلمان باز کردہ" کے سلسلے میں جو رول ادا کیا، وہ اتنا اہم

ہے کہ ہم اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں، کوئی اسے مانے یا نہ مانے کہ یہ "الہلال کی دعوت" کا اثر تھا اور الہلال ہی نے وہ زمین تیار کی تھی جس پر بعد کو جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت نے اپنی اپنی عمارت کھڑی کی۔

افسوس کہ یہ موضوع آج تک تشنہ تحقیق ہے۔ الہلال کی دعوت کا عمیق اور وسیع مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھا جائے کہ اس نے ہر ہفتے کیا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ اور وہ کس طرح کے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے کوشاں رہا۔ الہلال کی عمر بہت کم رہی، لے دے کے یہی تین برس یا کچھ زیادہ۔ لیکن اس زمانے کے حالات کے پیش نظر اس کی اشاعت غیر معمولی تھی۔ یہ ہر ہفتے ۲۰-۲۵ ہزار چھپتا تھا۔ گویا اس کے قارئین ایک لاکھ کے قریب ہونگے۔ اسی لیے اس کے اثرات اور نتائج بہت دور رس اور پائیدار ثابت ہوئے۔

تقابلے مطالعے سے دیکھنا چاہیے کہ جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے طریقہ کار اور مقاصد نے الہلال کی دعوت سے کس حد تک فائدہ اٹھایا۔ مطالعے کے دوران میں انحراف اور رد و بدل کے پہلو بھی سامنے آسکتے ہیں۔ لیکن اس سے الہلال کی دعوت کی اہمیت کم ہوتی ہے، نہ ان تحریکوں کے اس سے متاثر ہونے کی تغلیط۔

سیاسی اصلاح

الہلال کی دعوت کا دوسرا محاذ سیاسی تھا۔

۱۸۵ء کی ناکام تحریک کے بعد یہاں کے مسلمانوں پر جو اقتاد پڑی، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اس کا وقتی علاج سرسید احمد خان مرحوم نے اپنی بصیرت کی روشنی میں پوری دیا۔ انتداری سے پیش کیا۔ ان کی تحریک بہت حد تک کامیاب رہی جس سے مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار اور اعتماد بحال بھی ہو گیا۔ لیکن ان کے بتائے ہوئے طریقہ کار میں ایک رخا پن تھا۔ اس میں حالات کی تبدیلی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی پالیسی میں استواری اور پائیدگی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس میں تبدیلی یا اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ اس کی اصلاح اور علاج کی بنیاد مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال نے مہیا کی۔ بیشک ان کے خیالات

بعض ہم عصر مصری اکابر اور دوسرے مفکرین مثلاً سعید حلیم پاشا، مصطفیٰ کامل پاشا، جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبده وغیرہ سے بہت متاثر تھے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کا ماخذ اور منبع قرآن کریم اور حدیث و سنت تھے۔

افسوس! اس موضوع پر بھی جتنا اور جس انداز سے لکھنے کی ضرورت تھی، نہیں لکھا گیا۔ اس مسئلے کا گہرائی سے مطالعہ کر کے ہمیں الہلال کے اثرات کو متعین اور مرتب کرنا چاہیے۔

ترجمان القرآن

دوسرا موضوع ترجمان القرآن کا ہے۔ افسوس کہ یہ تفسیری ترجمہ مکمل نہ ہو سکا۔ اس وقت ہمیں ان اسباب کی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں، جو اس کے نامکمل رہ جانے کا باعث ہوئے۔ مولانا مرحوم کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام انھوں نے دو مرتبہ کیا۔ دونوں دفعہ پولیس کی خانہ تلاش کے نتیجے میں یہ مسودے درہم برہم بلکہ تباہ ہو گئے اور انھیں اسے نئے سرے سے تیار کرنا پڑا، جو ہمارے سامنے ہے۔

لیکن میں ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جن اصحاب نے لکھا ہے کہ مرحوم نے تیسری جلد بھی مکمل کبلی تھی اور اس کا مسودہ ضرور کہیں نہ کہیں ان کے کاغذات میں موجود ہوگا، وہ غلطی پر ہیں۔ مرحوم سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے دو ہفتے قبل جمعہ، ۷ فروری ۱۹۵۸ء صبح کے وقت ہوئی تھی اور یہ اچھی خاصی طویل اور تفصیلی ملاقات تھی۔ اس دن منجملہ اور باتوں کے میں نے ان سے گزارش کی کہ وہ ترجمان القرآن کی تیسری جلد مکمل کر دیں۔ اس پر انھوں نے صراحت سے فرمایا کہ واقعی میری گونا گوں مصروفیتوں کے باعث ترجمان القرآن کی تکمیل کا کام آج تک مرض التو میں پڑا ہوا ہے، اور میں اس طرف توجہ نہیں کر سکا۔ اب انشاء اللہ جلد ہی میں اسے لکھنا شروع کر دوں گا، اور حسب معمول (عبدالقیوم) خان صاحب کاتب نوبوا کے مسودہ انھیں دیتا جاؤں گا۔ اس کے ہفتہ بھر بعد وہ غسل خانے سے نکلتے ہوئے پھسل کر گرے اور ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور چند دن بیمار رہ کر وہاں پہنچ گئے جو ہم سب کی منزل مقصود ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اَلْ قَدْحُ بِشَکْسْتِ وَاَنْ سَافِی نَمَانْد۔

لیکن جو دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، وہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ ان سے بہت حد تک پورے قرآن کی تفسیر کا اسلوب اور انداز ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جب ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے تو جس سرگرمی اور گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا گیا، وہ حیرتناک تھا۔ میں یہاں صرف مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی رائے پر اکتفا کر ڈنگا۔ انھوں نے "معارف" میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے وقت کی اہم ضرورت قرار دیا تھا۔ لکھتے ہیں:

ترجمان القرآن وقت کی اہم چیز ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر

پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعے کی ترغیب دی جائے

اور ہر اسلامی دارالمطالعہ میں اس کا ایک نسخہ منگوا کر رکھا جائے۔

سوال یہ ہے کہ بیسوں ترجمے اور تفسیر کی کتابیں موجود ہوتے ہوئے ترجمان القرآن کو یہ اہمیت کیوں دی گئی؟ اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے منتقدوں اور مصنفوں کو ترجمان القرآن پر اس پہلو سے غور کرنا چاہیے کہ اس کی زبان، ترجمے کی صحت، استدلال کی جدت اور بیان کی سگفتگی نے اسے ایک تخلیقی کارنامے کا درجہ دے دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر اس نقطہ نظر سے روشنی ڈالی جائے کہ یہ س حد تک مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی ضروریات کو فقہ اور مذہب کی موٹنگائیوں میں جاسے بغیر، پورا کر سکتا ہے؟ میرے خیال میں ترجمان القرآن پر اس پہلو سے ابھی تک کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔

مولانا آزاد تفسیر میں ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید ابن تیمیہ سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے "سلف" کے طریقے کی حمایت میں اور "تفسیر بالرائے" کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ ابن تیمیہ کا بھی یہی اصول تھا۔ ابن تیمیہ اور ابن تیمیہ کی تحریروں اور ترجمان القرآن کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور واضح کیا جائے کہ کہاں تک مولانا آزاد نے ان کا متبع کیا، اور کس جگہ اور کتنا اس سے پرہیز کیا۔

آزاد بحیثیت ادیب

الہلال کی سب تعریف کرتے ہیں اور بے شک، یہ تعریف کے قابل تھا بھی، اور آج تک ہے۔

اس کی شکل و صورت، اس کا معیارِ طباعت و تصاویر وغیرہ ہماری صحافت میں بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی۔ آج تک بھی، 'الاماشار اللہ' کوئی پرچہ اس معیار کو نہیں پہنچ سکا۔ لیکن یہ تو تصویر کا ایک رُخ تھا۔

اس کی اصلی اہمیت اور کشش اس کی معنوی خوبیاں تھیں۔ مولانا آزاد اور ان کے ہمکاروں نے مضامین کا جو نمونہ پیش کیا، اس سے ملک بھر چونک اُٹھا۔ خود مولانا آزاد کی تحریریں ان کا موضوع اور دعوتی اندازِ کلام اور اسلوبِ تحریر ایسا بدیہہ تھا کہ اہللال کے فتاری مسخور ہو گئے۔

ستم یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو 'خاص کر نثر کو' کیا کچھ دیا، یا ان کا اردو نثر پر کوئی اثر پڑا یا نہیں، اس کا کوئی وقیع جائزہ آج تک نہیں لیا گیا۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوا۔ گذشتہ نصف صدی میں ادبِ اردو کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں، لیکن ان میں سے بیشتر میں ان کا نام تک نہیں ملتا۔ آخر کیوں؟

آزاد کا نظریہ و تعلیم

مولانا آزاد ۱۹۲۶ء سے اپنی وفات ۱۹۵۸ء تک بارہ برس ہندستان کے وزیرِ تعلیم رہے۔ اس دوران میں انھوں نے پارلیمنٹ میں، مختلف کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں بیسیوں تقریریں کیں۔ سیکڑوں فائلوں پر مختلف مسائل کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی یہی آراء ملک کی موجودہ تعلیمی پالیسی کی بنیاد ثابت ہوئیں۔ جن اصحاب کو حکومتی دفتروں میں کام کرنے کا موقع ملا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی محکمے کا وزیر کس حد تک پالیسی کے تعین اور تشکیل میں مؤثر اور معاون ہوتا ہے۔ یقیناً مولانا آزاد بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

میں نے "خطباتِ آزاد" میں ان کی اس نوع کی دو تقریریں شامل کی ہیں (ہندستانی کمیٹی، بہار ۱۹۳۷ء اور عربی نصاب کمیٹی لکھنؤ، فروری ۱۹۴۷ء) افسوس کہ بوجہ میں آج تک خطبات کی بقیہ جلدیں شائع نہیں کر سکا۔ اور انھوں نے اپنی تقاریر میں اور فائلوں پر جن خیالات کا اظہار فرمایا، اپنی مجبوریوں کے باعث انھیں بھی جمع نہ کر سکا۔ یہ کرنے کا کام ہے اور ضرورت

ہے کہ کوئی صاحب علم ماہر تعلیم ان تمام تحریروں کو جمع کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ کام وقت طلب ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں۔ اس سے ہمیں ان کے نظریہ تعلیم اور طریق کار کے بارے میں روشنی ملیگی۔ اور ممکن ہے کہ ہماری کچھ تعلیمی مشکلات کے حل کرنے میں بھی وہ معاون ثابت ہوں۔

کرنے کے بعض اور کام بھی ہیں۔ لیکن اگر بنیادی طور پر اتنا کچھ بھی ہو جائے، تو بہت حد تک ہم مولانا آزاد کی صحیح تصویر اور ان کی خدمات کا صحیح جائزہ پیش کر کے اپنے آپ سے اور دین و مذہب سے سُرخرو ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردانگنِ عشق

ابوالنصر غلام حسین آہ

دنیا میں کئی ایسے شخص پیدا ہوئے جنہوں نے 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' کے مصداق کم عمری ہی میں غیر معمولی دماغی اور ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اگر انہیں موقع ملتا تو وہ یقیناً ترقی کرتے، علم و فن کے خدمتگذار ثابت ہوتے، بنی نوع انسان کے علم میں اضافہ کرتے، اور ملک و قوم کی نیکنامی و ناموری کا باعث قرار دیے جاتے۔ لیکن موت نے انہیں فرصت نہ دی، ان کا پیمانہ حیات قبل از وقت لبریز ہو گیا اور وہ اپنی تمام معنوی خوبیاں ساتھ لیے یہاں سے چل بسے۔

ایسی ہی ایک شخصیت مولانا ابوالنصر غلام حسین آہ کی بھی ہے۔ ان کا نام اتنا مشہور نہیں ہوا جتنا ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالکلام غلام محی الدین احمد آزاد کا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا عین عنفوان شباب میں انتقال ہو گیا جس سے انہیں اپنی وہی صلاحیتوں اور اکتسابی قابلیتوں کے اظہار کا پورا موقع نہ ملا۔ وفات کے وقت ان کی عمر یہی ۲۰-۲۱ سال کی رہی ہوگی۔

ان کے والد مولانا محمد خیر الدین ہندستان سے ہجرت کر کے مکے میں جا بسے تھے۔ انہوں نے

۱۔ ان کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے آزاد کی کہانی: ۶۶-۱۷۷؛ نیز غبارِ خاطر (حواشی): ۳۰۲

وہاں پہنچ کر شیخ ابراہیم کردی المدنی کے خاندان کے نام لیوا ایک عالم شیخ محمد ظاہر وتری مدنی کی بھانجی عالیہ سے شادی کی جس سے ان کے پانچ اولادیں ہوئیں :
 تین بیٹیاں : زینب - فاطمہ عرف آرزو بیگم اور حنیفہ عرف محمودہ (آبرو بیگم) اور دو بیٹے :
 ابوالنصر غلام یسین اور ابوالکلام غلام محی الدین^۲۔
 مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ میرے بھائی عمر میں مجھ سے دو برس (دوسری جگہ : دو تین برس) بڑے تھے۔ چونکہ خود مولانا آزاد ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ / اگست - ستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے تھے اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ غلام یسین کا سال ولادت ۱۸۸۵ء / ۱۸۸۶ء ہوگا۔
 ان کی تعلیم مکے میں شروع ہوئی۔ وہ چھ سات سال کے ہونگے جب کہ ان کی بسم اللہ کی رسم حرم کعبہ میں شیخ عبد اللہ مرداد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کی حسب ذیل تفصیل مولانا ملیح آبادی کی مرتبہ کتاب میں ملتی ہے جو ان کے قول کے مطابق خود مولانا آزاد کے لفظوں میں ہے۔ لکھتے ہیں^۳ :

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب حرم شریف میں بسم اللہ کی تقریب کرائی گئی اس وقت میری عمر پانچ برس کی تھی عصر کا وقت تھا اور مرحوم شیخ عبد اللہ مرداد سے والد مرحوم نے یہ رسم ادا کرائی تھی۔ انہوں نے مجھ سے تین مرتبہ 'یا فتاح' کہلویا اور 'سَبِّتْ یَسْبِتْ وَلَا تَعْبِتْ' کہلویا اور اس کے بعد الف سے شین تک حروف شناخت کرائے.... میٹھے سمو سے قاب میں بھرے ہوئے ہمارے ہاں

۲- غیر مطبوعہ تحریر : ۲

۳- غبارِ خاطر : ۹۸ : نیز غیر مطبوعہ تحریر : ۲

۴- آزاد کی کہانی : ۱۶۸ (دہلی ۱۹۵۸ء)

۵- تذکرہ : ۳۱۰ (ساتھیہ اکادمی ایڈیشن - دہلی ۱۹۶۸ء)

۶- آزاد کی کہانی : ۱۸۷

سے آئے تھے، جو وہاں تقسیم کیے گئے۔ میں لپٹائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا اور حافظ صاحب انہیں تقسیم کر رہے تھے۔ لیکن شیخ عبداللہ نے اس قاب سے، جو ان کے سامنے پڑی تھی، ایک سوسہ اٹھا کے مجھے دیا، اور جب میں اسے لینے لگا تو انہوں نے نہیں دیا اور اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں رکھ دیا۔ دراصل یہ تقریب بھائی مرحوم کی تھی اور مجھے بھی بٹھلا دیا گیا تھا۔

گویا مولانا آزاد بھی ان کے ساتھ طفلانہ تفتن کے طور پر بٹھا دیے گئے تھے، اور ان کی بسم اللہ بھی اسی موقع پر ہو گئی، حال آنکہ ان کی عمر بمشکل پانچ ایک سال کی رہی ہوگی۔ اس کے بعد ان دونوں کی تعلیم گھر پر ہونے لگی۔ بیشتر انہیں ان کی خالہ پڑھاتی تھیں، اگرچہ باہر کے بعض اساتذہ سے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہاں انہوں نے تقریباً تین برس میں قرآن ختم کر لیا اور اس کے بعض حصے مثلاً یس، قاف وغیرہ حفظ بھی کر لیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی عربی صرف و نحو میں اُجرومیہ بن مالک بھی شروع کر دی۔

۱۸۹۸ء میں ان کے والد مولانا محمد خیر الدین حجاز سے ہندوستان چلے آئے اور بالآخر انہوں نے یہاں پہنچ کر کلکتہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں ان دونوں بھائیوں کی تعلیم درس نظامیہ کے نصاب کے مطابق ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی درس میں شامل ہو گئیں۔ یہ تمام تعلیم قدرتی طور پر ان علماء سے حاصل کی گئی، جو عقائد میں ان کے والد مولانا محمد خیر الدین کے معیار کے مطابق ٹھیک مسلمان تھے۔ یعنی جن اصحاب کو جدید خیالات و تصورات کی جنہیں وہ دہا بیت کہتے تھے، ہوا تک نہ لگی ہو۔ ابوالنصر غلام یسین نے علوم درسیہ کے علاوہ طب میں بھی اچھی واقفیت حاصل کی تھی۔

۷۔ اس سے حافظ دل اللہ بناری مراد ہیں، جو مولانا خیر الدین کے قدیم اور معتد علیہ خادم تھے۔

۸۔ آزاد کی کہانی: ۱۸۸-۱۸۹

۹۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۱

انہوں نے شیخ الرئیس کی قانون کے تینوں مباحث کی تکمیل کی تھی۔ وہ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی بھی جانتے تھے، جو انہوں نے ایک ترک طاہربک سے پڑھی تھی۔

طاہربک قوم کے ترک تھے اور یمن و شام میں مختلف سرکاری عہدوں پر متمکن رہ چکے تھے۔ قسطنطنیہ میں وہ ایک پریچ "ترجمان حقیقت" کے مدیر رہے۔ متعدد زبانیں جانتے تھے؛ فرانسیسی اور فارسی اور عربی بھی اتنی ہی روانی سے بولتے تھے، جتنی اپنی مادری زبان ترکی۔ وہ بڑی پریشان حالی میں پھرتے پھرتے کھلتے پیچھے تھے۔ مولانا آزاد سے ملاقات ہوئی تو یہ انہیں مکان پر لے آئے اور والد کی اجازت سے ان سے ترکی پڑھنا شروع کی۔ مولانا آزاد تو تعلیم جاری نہ رکھ سکے، لیکن آہ پوری مستعدی سے پڑھتے رہے!

آہ کا گھر کا ماحول سراسر علمی تھا۔ ان کے والد بلاشبہ پرانے رنگ کے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ اس پر طریقت کی چاشنی مستزاد۔ ظاہر ہے کہ ان کے ملنے والے بھی یا تو علوم دین کے ماہر بزرگ ہونگے، یا اصحاب تصوف میں سے۔ ایسے گروہ پیش میں اولاد کا علم و تعلم اور تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہو جانا چنداں تعجب کی بات نہیں۔ چنانچہ یہ دونوں بھائی بہت کم عمر ہی میں نظم و نثر لکھنے لگے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مولانا ابوالکلام کی طبیعت کا رجحان شروع سے صحافت اور اخبار نویسی کی طرف زیادہ رہا؛ اس کے مقابلے میں غلام یحییٰ نے صرف نظم و نثر پر توجہ کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کوئی دس سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ بڑے بھائی نے ان سے پیچھے رہنے میں ہمیشگی کی اور آہ تخلص اختیار کیا۔ دونوں داغ کے شاگرد ہوئے۔ آزاد تو جلد ہی انہیں چھوڑ گئے؛ لیکن آہ نے استواری اور استقامت کا مظاہرہ کیا اور داغ کے انتقال

۱۰۔ آزاد کی کہانی: ۲۰۰

۱۱۔ ایضاً: ۲۳۵-۲۳۶

تک انھیں کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ داغ کا فروری ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا ہے۔ اس وقت آہ کی عمر بمشکل ۱۹۔۲۰ برس کی ہوگی۔ اس کم عمری میں اور لے دے کے پانچ چھ برس کی شاعری کے باوجود ان کا داغ کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ مولانا احسن مارہروی نے استاد کی زندگی ہی میں ان کے حالات پر مشتمل ایک کتاب 'جلوہ داغ' کے نام سے شائع کی تھی (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۳ء)؛ یہی ان کی سب سے پہلی سوانح عمری ہے۔ اس میں انھوں نے داغ کے بیشتر ممتاز شاگردوں کا ذکر بھی کیا ہے لیکن اس فہرست میں آہ کا نام نہیں ملتا۔ آہ نے اس کتاب سے متعلق ایک تعریفی مضمون احسن الاخبار کلکتہ میں لکھا تھا: نصیح الملک مرزا داغ دہلوی کا قابل قدر ہدایت نامہ۔ اسی مضمون کے آخر میں انھوں نے احسن مارہروی کا ایک خط بھی نقل کیا ہے، جو انھوں نے آہ کے نام لکھا تھا۔ احسن لکھتے ہیں:

مجھ سے جلوہ داغ میں ایک غلطی ہو گئی ہے، اس کا اعتراف ہے۔ وہ یہ کہ جہاں ممتاز تلامذہ کے نام لکھے ہیں، ان میں آہ کا نام نامی سہواً رہ گیا ہے؛ یہ محض بشریت ہے۔ انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی صحت ہو جائیگی۔

اس پر کسی حاشیے کی ضرورت نہیں۔
نظم کے علاوہ وہ آغاز ہی سے نثر بھی لکھنے لگے تھے۔ چنانچہ اسی احسن الاخبار میں انھوں نے ایک سلسلہ مضامین 'النیام' کے عنوان سے لکھا، جو بعد کو اسی نام سے کتابی شکل میں مطبع آصفی، لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات میں ایک عربی رسالہ 'نخبۃ الناظر' ہے؛ آہ نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ترکی زبان کی صرف و نحو بھی اردو میں قلمبند کی تھی؛ یہ بھی چھپ چکی ہے۔

منشی نوبت رائے نے ۱۸۹۷ء میں ماہنامہ 'خداگ نظر' جاری کیا۔ شروع میں یہ محض

۱۲۔ اس تمام تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا ابوالکلام آزاد، از عابد رضا بیدار: ۸۰ (دہلی، ۱۹۶۸ء)

گلدستہ تھا؛ اس نوع کے دوسرے پرچوں کی مانند اس میں بھی 'طرح' کا اعلان ہوتا اور اس پر شعراء کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ مولانا آزاد نے نظر کو لکھا کہ اگر آپ اس میں نثری مضامین کا اضافہ کر دیں تو میں ان کی ترتیب کا ذمہ لیتا ہوں، چنانچہ اس کے بعد 'خدمتِ نظر' میں مقالات بھی چھپنے لگیں۔ آہ بھی اس رسالے میں لکھا کرتے تھے۔ ان کا کلام نظم و نثر اس کے متعدد شماروں میں ملتا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ اس پرچے کی اور کئی طریقوں سے بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ مثلاً اس کی اشاعت بڑھانے کے لیے خریدار مہیا کرنا، مالی امداد کرنا، وغیرہ۔ جو لوگ پرچے کے خاص ہمدرد اور سرپرست تھے، نظر ان کے نام کے ساتھ 'معاونِ خدمتِ نظر' کے الفاظ لکھا کرتے تھے۔^{۱۳} متعدد شماروں میں آہ کے نام کے ساتھ 'معاونِ خدمتِ نظر' کے لفظ ملتے ہیں۔ بلکہ اپریل ۱۹۰۰ء کے پرچے میں شکریہ کے عنوان کے تحت ان "معززین اور عالی حوصلہ حضرات کے نام نامی" شائع ہوئے ہیں، جنہوں نے 'خدمتِ نظر' کے ہر سہ ہفتوں کی خریداری منظور فرما کر پیشگی قیمت عنایت فرمائی۔ ".... ایسے حضرات بہت زیادہ شکرگزاری کے مستوجب ہیں، جنہوں نے قیمت مقررہ سے زیادہ عنایت فرمائی۔" اسی آخری زمرے میں ایک نام عالی جناب مولوی غلام یسین صاحب آہ دہلوی از کلکتہ کا بھی ہے۔ انہوں نے آٹھ روپے ادا کیے تھے؛ اصل چندہ صرف تین روپیہ سالانہ تھا۔

دورانِ مطالعہ میں مختلف پرچوں میں ان کے مندرجہ ذیل نثری مضامین میری نظر سے گزرے ہیں:

جون ۱۹۰۲ء

مخزن

مشک

اکتوبر ۱۹۰۲ء

مخزن

اہلِ حق کے مذاہب (۱)

۱۳۔ مثلاً جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارے میں آہ کے علاوہ مندرجہ ذیل اصحاب کے ناموں کے ساتھ بھی یہ الفاظ ملتے ہیں: (۱) حاجی تاجل حسین صاحب تاجل جلاپوری؛ (۲) سید مراد حسن صاحب مراد تاجر کتب کلکتہ؛ (۳) حاجی حافظ محمد حسن صاحب نصرت از بمبئی۔ اس کے بعد سنی کے شمارے میں ایک اور صاحب حسن علی صاحب بھی شجاع الدین صاحب سوداگر بمبئی کے نام کے ساتھ یہی لفظ لکھتے ہیں۔

فروری ۱۹۰۳ء	مخزن	اہلِ حنا کے مذاہب (۲)
جنوری ۱۹۰۶ء	خاتون	{ قطراتِ موسیقی (علیہ شفیقہ کے ترکی مضمون کا اردو ترجمہ)
اپریل ۱۹۰۲ء	خداگ نظر	تحریر (۱)
جولائی ۱۹۰۳ء	خداگ نظر	تحریر (۲)
اگست ۱۹۰۲ء	خداگ نظر	عالمِ اجسام (۱)
ستمبر ۱۹۰۲ء	خداگ نظر	عالمِ اجسام (۲)
دسمبر ۱۹۰۲ء	خداگ نظر	{ حیوانات کی تعجب خیز پرستش : مصر کا مشہور دیوتا آمون
دسمبر ۱۹۰۲ء	خداگ نظر	مشہور رومی فصیح : سسرود (۱)
جنوری ۱۹۰۳ء	خداگ نظر	مشہور رومی فصیح : سسرود (۲)
فروری ۱۹۰۳ء	خداگ نظر	عالمِ اجسام (۳)
مارچ ۱۹۰۳ء	خداگ نظر	فلسفہ
اپریل ۱۹۰۳ء	خداگ نظر	عالمِ اجسام (۴)
جون ۱۹۰۳ء	خداگ نظر	قدیم مصریوں کے رسومِ تہنیز و تکفین
جولائی ۱۹۰۳ء	خداگ نظر	عربوں کی بت پرستی
۲۰ دسمبر ۱۹۰۳ء	لسان الصدق (۲:۱)	شادی (اسراف کے خلاف)
۲۰ جنوری ۱۹۰۴ء	لسان الصدق (۱:۲)	توہات کی زندگی
مارچ ۱۹۰۴ء	ایضاً (۳:۲)	اردو کا ڈکھڑا اور ہنگامہ
	ایضاً	شگون
مئی ۱۹۰۴ء	ایضاً	سادہ لوحی
	ایضاً (۳: ۱-۲)	ڈی ماس تھینیر: یونان کا ایک فاتح لکچر (ترجمہ از انگریزی)

کائناتیں یعنی ایمانی قوت }
قبروں پر پھول چڑھانا }
مضامین مرقع عالم
(بحوالہ "ہماری زبان" ۲۲، نومبر ۱۹۷۰ء ص ۴)

مولانا آزاد اور آہ اپریل ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے لاہور گئے تھے۔ دونوں نے اس موقع پر تقریریں بھی کی تھیں۔ آہ کی تقریر انجمن کی سالانہ رواد میں موجود ہے۔ وصل بلگرامی کے تعزیتی شذرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آہ انجمن کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۰۵ء میں بھی شامل ہوئے تھے اور انھوں نے اس موقع پر بھی تقریر کی تھی۔

آہ کو اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھے جو اتفاق سے جلد میسر آ گیا۔ ایک صاحب تھے حافظ عبدالرحمن امرتسری؛ انھوں نے اسلامی ملکوں کے بہت چکر کاٹے تھے، اسی باعث اپنے نام کے ساتھ "سیاح ممالک اسلامیہ" لکھا کرتے تھے؛ ان کا سفر نامہ چھپ چکا ہے، آہ کی کہیں ان سے ملاقات ہو گئی۔ ان کی دلچسپ باتوں نے گویا سمند شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ دونوں نے عراق اور مغربی ایشیا کے مختلف ممالک کی سیر کا منصوبہ بنایا۔ مولانا آزاد بھی ان کے ساتھ تھے۔ جب یہ قافلہ بغداد پہنچا، تو مولانا آزاد سخت بیمار پڑ گئے۔ چونکہ ایسی حالت میں ان کا سفر جاری رکھنا خطرہ سے خالی نہیں تھا، یہ بغداد سے ہندستان واپس چلے آئے۔ آہ اور حافظ عبدالرحمن آگے بڑھ گئے اور موصل، دیار بکر سے ہوتے ہوئے شام و لبنان پہنچے۔ اس سال ان نواح میں سخت برفباری ہوئی تھی، اور سردی بہت شدید تھی۔ ہندستانی مزاج کو ایسا موسم کمتر ہی راس آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پھیپھڑوں پر حملہ ہوا۔ یہی تکلیف آگے چل کر موت کا بہانہ بن گئی۔ مولانا آزاد کا خیال ہے کہ ان کے ہمسفر حافظ عبدالرحمن نے کوئی خاص حق رفاقت ادا نہ کیا اور ان کی دیکھ بھال میں کوتاہی کا ثبوت دیا۔ رفتہ رفتہ آہ کی حالت خراب سے خرابتر ہوتی گئی۔ اس بیماری کی حالت میں وہ بلاد شام سے واپس بغداد آئے۔ یہاں اس زمانے میں سید بجا، حیدر، پیدر، انگریزی ٹولسل خانے میں بحیثیت معاون ملازم تھے۔ انھوں نے ہر طرح سے مدد کی۔ جب مولانا خیر الدین کو

بمبئی میں بیٹے کی بیماری کی خبر ملی، تو انھوں نے یہاں سے روپیہ بھجوایا اور یہ واپس وطن آئے، لیکن کس حالت میں کہ تندرستی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ والد انھیں لے کر کلکتے پہنچے۔ علاج معالجے کے باوجود کچھ افاقہ نہ ہوا اور بالآخر ان کا نمونہ (ذات الجنب) سے ۱۹۰۶ء میں انتقال ہو گیا۔ قبرستان مانک تل میں اپنی خاندانی ہڑواڑھی میں دفن ہوئے۔

مولانا خیر الدین کو جواں سال بیٹے کی موت سے جو صدمہ ہوا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آہ اپنے والد کے بہت چہیتے فرزند تھے۔ مولانا آزاد بہت ابتدا ہی میں سرسید کی تحریروں کے مطالعے کے بعد اپنے موروثی عقائد سے بغاوت کر چکے تھے۔ مولانا خیر الدین پیری مریدی کے قائل اور بہت قدامت پرست تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ میرے بعد یہ سلسلہ آزاد تو چلانے سے رہے! اس لیے انھوں نے اپنی خاص تصوف کی تعلیم اور توجہ کے لیے آہ کو چنا۔ آہ بھی امتحان میں پورے اترے۔ وہ بڑے راسخ الاعتقاد اور اپنے خاندانی عقائد اعمال میں بہت پختہ تھے اور ہر بات میں والد کے نقش قدم پر تھے۔ انھیں کی طرح سے عقائد کہتے اور اپنے لب و لہجہ اور حرکات و سکنات میں پوری طرح ان کی تقلید کرتے تھے۔ آہ کو لباس، چال ڈھال، وعظ کہنے کا طریقہ اس حد تک اپنے والد سے ملتا جلتا تھا کہ جن لوگوں نے مولانا خیر الدین کے وعظ سنے تھے، وہ اعتراف کرتے تھے کہ آہ کے وعظوں میں بھی وہ لطف آتا ہے۔

آہ کی وفات پر مقبول حسین وصل بگرامی نے اپنے رسالے عالمگیر (اکتوبر ۱۹۰۶ء) میں یہ تفصیلی شذرہ لکھا تھا:

مولوی ابوالنصر غلام یلین آہ دہلوی مرحوم نہایت ہی لائق مضمون نویس اور عمدہ شاعر تھے۔ آپ کا کلام اکثر خدنگ نظر اور دیگر علمی رسالوں میں

۱۵۔ ایضاً: ۱۲۵

۱۶۔ ابوالکلام آزاد (بیدار): ۲۲-۲۳

شائع ہوتا رہا ہے۔ نثر کے مضامین، کوئی ایسا اُردو اخبار اور رسالہ نہ تھا جس میں نہ نکلتے رہے ہوں۔ ۱۹۰۵ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں خاکسار سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اور اس جلسہ میں آپ نے جو لکچر دیے اور تنظیمیں پڑھیں، ان کا ایک ایک لفظ آپ کی اعلیٰ لیاقت اور جدت پسند طبیعت کا شاہد تھا۔ حاضرین و سامعین سُن سُن کر نصیرہ آفریں بلند کر رہے تھے۔ حال میں آپ اسلامی ممالک کی سیر کو گئے تھے۔ وہاں سے آتے ہی آپ نے انتقال کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہمیں آپ کی ناگہانی اور ہیوقت موت کا افسوس اور سخت افسوس ہے۔ ایسا ہونہار اور علمی مذاق کا دلدادہ کہاں سے لائینگے! خدا آپ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کے اعزہ کو صبر جمیل۔ یقین ہے کہ آپ نے اپنے سفر نامے کا مسودہ ضرور چھوڑا ہوگا۔ امید ہے کہ آپ کے چھوٹے بھائی محترمی حضرت ابوالکلام آزاد دہلوی جو مشہور انشا پرداز ہیں آپ کا سفر نامہ آپ کی سوانح عمری اور کلام و مضمون ضرور ایک جگہ ترتیب دے کر شائع کریں گے اور ان کی مختصر سرگذشت سے ہمیں آگاہ کریں گے۔

آہ نے غالباً سفر نامہ تو نہیں چھوڑا، لیکن وہ اپنے سفر کے دوران میں ہفتہ وار وطن لاہور کو مراسلات بھیجتے رہے تھے۔ ان خطوط میں ان کے سفر کے کوائف اور بہت دلچسپ معلومات ہیں۔

آہ کا بہت کم عمری میں نکاح ہو گیا تھا۔ ان کے والد کے ایک بہت فخلص مرید آفتاب الدین صاحب تھے۔ وہ مدۃ العمر کھلتے ہیں سرور کے نکلنے میں نمازم رہے اور یہیں سے انہوں نے نیشن پائی۔ ان کے پاپٹ بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے دو آہ اور آزاد کے عقد نکاحات میں تھیں۔ آہ کے ان سے ایک صاحبزادہ نور الدین احمد پیدا ہوا۔ یہ افضل اب بھی میاں ہیں، کلکتہ میں قیام ہے۔

آہ نے بہت کم عمر پائی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات کے وقت وہ ۲۰-۲۱ برس سے زیادہ کے نہیں ہونگے۔ ان کی شاعری کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی، لے دے کے یہی چھ سات برس کی۔ لیکن اس کے باوجود لوگوں نے انھیں اس قابل خیال کیا کہ ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیں۔ مطالعے کے دوران میں مجھے ان کے دو شاگردوں کے نام ملے ہیں، اول ہنشی سلیم خان سلیم مولود خوان (بمبئی) اور دوسرے شیخ احمد جنیری وآہ رئیس بمبئی۔ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ آہ کا دیوان تقریباً مکمل ہو چکا تھا جس میں ہر صنف کا معتدبہ کلام تھا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد تلاش کر دیا، تو نہیں ملا، دوران مطالعہ میں مجھے جو کچھ دستیاب ہوا، وہ یہاں یکجا کر دیا گیا ہے۔ یقیناً اور بھی بہت ہوگا جو میری نظر سے رہ گیا۔

غزلیات

ایک دریا مری آنکھوں میں اُبلنے کے لیے
 کیا اٹھا رکھتے ہیں ہمیں سارے سنہلنے کے لیے
 ایک پر ایک گرا پڑتا ہے جلنے کے لیے
 آتشِ ہجر نہ کم تھی مرے جلنے کے لیے
 داغ دے جاؤ کوئی دل کے بہنے کے لیے
 سب مرے ساتھ ہی تیار ہیں چلنے کے لیے
 کیا بہا رانی مری پھولنے پھلنے کے لیے
 ایک ٹھوکر ہی کھالی تھی سنہلنے کے لیے
 سر پر آیا ہے دوپٹہ ترا ڈھلنے کے لیے
 ہر طرف آنکھیں بچھیں ہیں تپ چلنے کے لیے
 آپ بھی میری طبیعت ہیں چلنے کے لیے
 مے ہے ڈھلنے کے لیے جام ہیں چلنے کے لیے
 تیری تصویر سے باتیں ہیں بہنے کے لیے
 یا علی! منہ سے نکلتا ہے سنہلنے کے لیے
 دھانی پوشاک ننگاتے ہیں بدلنے کے لیے
 راہ پاتے نہیں ارمان نکلنے کے لیے
 اک یہی چال اٹھا رکھی ہے چلنے کے لیے

اشکِ حسرت ہیں تھے ہجر میں ڈھلنے کے لیے
 کوئی تدبیر نہیں دم کے نکلنے کے لیے
 چاہیے صورتِ پروانہ دل سوز طلب
 داغ کیوں تم نے دیا اہل کے رقیبوں مجھے
 لے گئے ہو جو مرے ہوش و خرد، صبر و قرار
 نزع میں دیکھے کوئی حسرت و ارمان کا، نجوم
 آبلے دل میں پڑے داغِ جگر کے ہمراہ
 جان ہی عشق کی افتاد نے لے لی آخر
 دو پہرِ حسن کی اب ہو چکی اے مستِ شباب!
 دیکھ یوں چاہتے ہیں چاہتے والے تجھ کو
 جب گرتے ہیں، سنہالے سے سنہلنے ہی نہیں
 ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے کیوں پیرمغاں
 سیکھ لے مجھ سے کوئی مشغلہ تنہائی
 لڑکھڑاتے ہیں کبھی زند تو دیکھ لے زاہد!
 کھا مینگے زہرِ حسینان جہاں آج ان پر
 جمعِ حسرت و اندوہ سے دم گھٹتا ہے
 تم سلامت ہو، تو آئے گی قیامت بھی کہیں

لوٹ جاؤ دل بیتاب ہمارا لے کر کوئی جسد نہیں درکار مچلنے کے لیے
 ہے مرے خانہ تارک میں یکساں شبے روز اک چراغ آٹھ پہر چاہیے جلنے کے لیے
 شاعر سی واہ طلب، واہ نہ دے جب کوئی، آہ!
 پھر تو اک شغل ہے یہ دل کے بہلنے کے لیے

(نیرنگ عالم، اپریل ۱۸۹۹ء)

۲

طالع بد سے نہ آئی راست اک تدبیر بھی
 تو پھر کیا ہم سے ظالم! پھر گئی تقدیر بھی
 دل میں لازم ہے خیالِ رُوے پُر تنویر بھی
 چاہیے اس آئینے کو نور کی تصویر بھی
 مستعد ہے جان دینے کو دلِ نخبیر بھی
 ناوک انگن، پاس تیرے ہے کہاں بھی تیر بھی
 سوئے زنداں جب ترا دیوانہ گیسو چلا
 پاؤ پڑنے کے لیے آگے بڑھی زنجیر بھی
 خاک میں ملنا ہے تجکو، خاک کا پتلا ہے تو
 خاک ہے منعم، یہ سازِ عیش بھی، تعمیر بھی
 جم گیا نقشہ رقیبوں کا دلِ دلدار پر
 ہو گئی بیکار اب تحریر بھی، تفسیر بھی
 سر میں سودا زلف کا ہے، ابروؤں کی دل میں یاد
 جان کے پیچھے پڑا ہے طوق بھی، زنجیر بھی
 آپ آئے خانہ دل میں، تو روشن ہو گیا
 اب چمک اٹھے، خدا چاہے، مری تقدیر بھی

بسملِ نوکِ مژہ ہوں، کشتہ ابروے یار
 ساتھ میرے ہو حسد میں، تیر بھی، شمشیر بھی
 کمنی میں چاہتے ہو تم اگر مشقِ جفا
 تر تھی چتون سے زرا سیکھو لگانا تیر بھی
 حالِ زخمی محبت سے کسے صدمہ نہیں
 خم کیے ہے سر کو اے قاتل! تری شمشیر بھی
 روح سارے جسم کی آتی ہے کھنچ کر کان میں
 سحر ہے ظالم! تری جادو بھری تقریر بھی
 آہ! اس سفاک نے ہم پر کبھی کھایا نہ رحم
 روتے جاتے ہیں ہمارے حال پر رہگیر بھی

(خدا ننگِ نظر، جنوری، ۱۹۶۰ء)

(۳)

کبھی اوستمگار! وعدہ وفا کر
 رقیبوں سے ہنستے ہو باتیں بنا کر
 تپِ عشق کی آگ بھڑکی ہوئی ہے
 نکایت یہ ہے دستِ قدرتِ ہم کو
 تجبلی پہ ہو جائیں مائل نہ موسیٰ
 ہوا بوسے مے لالی کیا میکدے سے
 ہنسیں بولیں میت پہ آکر جاری
 ہزاروں ہی دعدہ ہیں لاکھوں ہی پیالے
 مریض تپِ حیر کی کچھ دوا کر
 مری جان لینا ہے تم کو رلا کر
 مجھے بھی جلائیگی، دل کو جلا کر
 بگاڑا تمہیں خوبصورت بنا کر
 وہ بیٹھے ہیں پرے میں کیوں چھپا کر
 گرے شیخِ سجدے میں کیوں لڑکھڑا کر
 وہ بیٹھے ہیں کیوں زانی سورت بنا کر
 بہت سے نہیں ایک ہی دودن کر

۵۔ یہ مصرعہ طرح تھا۔

ترقی پہ ہے بیوفائی کسی کی
قیامت کا غصہ، غضب کے ہیں تیور
زمانے کی نیرنگیاں کوئی دیکھے
ابھی اور اے زندگی! کچھ وفا کر
مری جان لیتے ہو، آنکھیں دکھا کر
بگاڑے بہت خوبصورت بنا کر

مراد و پنہاں، مرے دل کی حسرت
وہ پوچھے کبھی آہ! مجھ کو بلا کر

(خدا نگ نظر، فروری، ۱۹۰۰ء)

(۴)

کہتا ہوں جب کہ مجھ پہ نگاہِ کرم نہیں
تیرے جفا و جور کا ہم کو الم نہیں
تکتے ہیں گاہِ محکو، کبھی وہ رقیب گو
اک میں کہ جان دیتا ہوں کس ذوق و شوق سے
دل کی تڑپ میں شوخیِ جاناں کا ہے مزہ
آئی صد امری لحدِ پامیال سے
ملتے ہی آنکھ، دل مرا چورنگ ہو گیا
کھنچ جانا بات بات پہ ان کا شبِ وصال
تم ہو زباں دراز، تو ہم بیزبان ہیں
جب سے کہ خطِ سبز کا نظارہ ہو گیا

عاشق نہ ہو دہان و مکر کا جو اس کی، آہ!
کچھ وہ مسافر رہ ملکِ عدم نہیں

(خدا نگ نظر، فروری، ۱۹۰۰ء)

(۵)

رات گزری، سونے والے سوچے
 جان اپنی رونے والے کھوچے
 سیکڑوں ٹکڑے جگر کے ہوچے
 حشر تک ممکن نہیں، جو ہوچے
 ہم شہید تیغِ ابرو ہوچے
 آج ہی کل میں قیامت ہوچے
 ہم کنارِ قبر میں بھی سوچے
 خط کو ہم اشکوں سے اپنے دھوچے
 کشتِ دل میں تخمِ حسرت بوچے
 دیکھتے ہی جانِ و دل گم ہوچے
 میرے پھولوں میں وہ آکر روچے
 نقدِ دل ہم بھی اسی جا کھوچے
 بحث یہ، رُخِ ت نقابِ الوِچے

بس کرو اب رونے والے روچے
 آپ کی چتون پہ عاشق ہوچے
 اب تو سیدھی کیجیے تر تھی نگاہ
 کچھ نئی حجت ہے، میری آپ کی
 آبرو پائی نگاہِ خلت میں
 یہ بھی وعدہ آپ کا ہم دیکھ لیں
 آرزویوں بھی نہ نکلی وصل کی
 سادہ کاغذ رہ گیا، اے نامہ بر!
 خالِ روئے یار کے عاشق ہیں ہم
 کیا دہن ہے، کیا کمر ہے آپ کی
 ہنس رہے ہیں باغ میں غیروں کے ساتھ
 کوئے جاناں میں عجب اندھیر ہے
 بڑھ کے ہے عارضِ تمہارا یا مگر

نخلِ غم پھولے پھیلے گا خلق میں
 آہ! ہم تخمِ محبت بوچے

(خداکب نظر، مارچ ۱۹۵۰ء)

(۶)

کشتِ حسرتِ ازل سے ہے دلِ ناکامِ عشق
 رونے سے پہلے پہل آکر دیا پیغامِ عشق

۵۰۰۰۰۰

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

آبلوں کا گنج گوہر دے کے صحرا نے کہا:
 سالکِ وحشت کو ملتا ہے یہی انعامِ عشق
 ساتھ پڑھنے جو آئے ہیں ہماری قبر پر
 دوستوں کو آج آتا ہے نظرِ انجامِ عشق
 آبلہ دل کا نہ ٹوٹا حشر تک، لے چارہ گر!
 عالمِ فانی میں ہے کس درجہ استحکامِ عشق
 اب نہ وہ جوشِ جوانی ہے، نہ داغوں کی بہار
 صبحِ پیری آئی بکھتے ہیں چراغِ شامِ عشق
 ہاے، وہ آنسو بہانا ان کا میری لاش پر
 اور وہ کہتا کہ ہوتا ہے یہی انجامِ عشق
 ہستے ہستے رنج و غم آخر تپتے ہیں یہ ہوا
 "جان دے کر کام اپنا کر گئے ناکامِ عشق"
 اب رسائیِ خلوتِ محبوب تک آسان ہے
 دل نے آہوں کو بسنا یا ہے کندِ بامِ عشق
 بٹ ہے ہیں جامِ الفتِ حسن کی خیرات میں
 دوست دشمن پر ہے یکساں آج فیضِ عامِ عشق
 جو تڑپنے میں مزا ملتا ہے ظالم! کیا کہوں
 میرے دل سے کوئی پوچھے لذتِ آلامِ عشق
 زہر کھا کر مر گیا اُس سبزہ رو کے عشق میں
 آہ نے پایا ہے ملبوسِ زمرّدِ نامِ عشق

(خداگ نظر، اپریل، ۱۹۰۰ء)

(۷)

مصحفِ رُخسار سے ہوتا ہے ہمسرا آئینہ
 کس قدر گستاخ ہے، اللہ اکبر آئینہ
 نامہ آئینہ رو ہے اے کبوتر! آئینہ
 تو تو اپنے ساتھ لایا ہے اڑا کر آئینہ
 پہلے دل پر ہاتھ رکھ لیجے کہ آجائے غش
 اپنی صورت دیکھیے گا پھر اٹھا کر آئینہ
 لے چلا ہے اس کے رُوسے صفا و روشن کا خیال
 راہِ الفت میں ہوا ہے اپنا رہبر آئینہ
 رُو برو کی چوٹ ہے، وہ بھی بڑا بیباک ہے
 دیکھیے صاحبِ ادم تیز میں سنبھل کر آئینہ
 موجزن اک نور کا دریا نظر آیا مجھے
 آگیا جس وقت اُس رُخ کے برابر آئینہ
 اب نہ چاہیں گے تمہیں لے ہو شانِ خود پسند
 ہم نے رکھا طاقِ نسیاں پر اٹھا کر آئینہ
 آئینہ میں ابروے نمودار اومت تل! نہ دیکھ
 ذبح کرتا ہے بٹھے بن بن کے نخبہ آئینہ
 روے تاباں دیکھتے ہی آگ دل میں لگ گئی
 شان اس کی، بن گیا سینے میں بچہ آئینہ
 عکس سے بھی اپنے آتی ہے انھیں شرمِ دنیا
 دیکھتے ہیں بہنِ ذہل آنکھیں پڑا کر آئینہ

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

پر تو روئے کتابی نے دیا مصحف کا کام
اللہ اللہ ہو گیا گویا پیمبر آئینہ

(خدنگ نظر، جولائی، ۱۹۰۰ء)

(۸)

جبے دل میں اس حسیں کی یاد ہے
ایک ہے سرور، اک ناشاد ہے
تم کو چاہا سب کی نظروں سے گئے
تید میں جلتا نہیں بلبل کا دل
نازہم سے اور غیروں سے نیاز
ایک عالم کی اڑائی اُس نے نیند
زندگی میں تھیں ہزاروں گردشیں
ہو گئی برباد اپنی خاک بھی
لطف کے پردے میں ظلم و جور ہیں
بن پڑے تو ہم بھی دیں خوروں کو دل
خاک کر دے آسماں کو تو سہی
بہر کی شب دیکھیے کینو بحر کے

خُور پیکر شعلہ فریاد ہے
بزم ہستی کی عجب رُوداد ہے
یہ ہمارے عشق کی افتاد ہے
یہ چراغِ خانہ صیتاد ہے
مہسراں! یہ آپ کا ایجاد ہے
اب مری فریاد کی فریاد ہے
مر کے بھی مٹی مری برباد ہے
وہ ابھی تک برسر بیداد ہے
کس ستم کا وہ ستم ایجاد ہے
دشمنِ جساں، حسنِ آدمزاد ہے
دوسری بجلی مری فریاد ہے
ہر ستارہ دیدہ جلاؤ ہے

جس کو سب کہتے ہیں آہِ نیجاں
یہ وہی تو خانساں برباد ہے

(خدنگ نظر، ستمبر، ۱۹۰۰ء)

۵ مصرع طرح: مبتلاے غم دلِ ناشاد ہے۔

(۹)

دکھتا کون ہے، چپکے سے لپٹ جاؤ بھی
 "آپ ہی ظلم کرو، آپ ہی پھٹاؤ بھی"
 ہو چکی تو بہ، بس اب ساغرے لاؤ بھی
 کچھ ہمارے دل بیتاب کو سمجھاؤ بھی
 تم کو کیا فکر ہے، صورت ہمیں دکھلاؤ بھی
 دل بڑھا جاتا ہے، یہ کہتا ہوا: آؤ بھی
 اور بجلی کی طرح، آپ ہی تڑپاؤ بھی
 روز کہتے ہو: ہم آئینگے! اجی، جاؤ بھی

شرم کیسی یہ شب وصل! ادھر آؤ بھی
 کیسے بیدار ہو، سفاک ہو تم، جاؤ بھی
 پرے آنکھوں پہ پڑے ہیں کہ بہا آئی ہے
 تم تو جانے ہی پہ تیار ہو صبح وصل
 ہم نے مانا کہ غش آجائے گا موسیٰ کی طرح
 پانو اپنے نہیں اٹھتے طرف منزلِ عشق
 دیکھ کر دل کی تڑپ، آپ ہی ڈر بھی جاؤ
 بات ہی وعدہ خلافی نے تمھاری کھودی

آہ کے دل کا بھی دھو جاے پس مرگ غبار
 چند آنسو کبھی تربت پہ بہا جاؤ بھی

(خدیجہ نظر اکتوبر ۱۹۷۰ء)

(۱۰)

چلو، سوتی قسمت جگاتے ہوئے
 ادھر دل کو پہلو سے جاتے ہوئے
 وہ نظروں سے ہم کو گراتے ہوئے
 بہت نیند کے آپ ماتے ہوئے
 تصور میں بھی ان کو آتے ہوئے
 ڈرو، گھر خدا کا گراتے ہوئے

سہرے قبر ٹھوکر لگاتے ہوئے
 ادھر دیکھا ظالم کو آتے ہوئے
 چلے اٹھ کے تیوری چڑھاتے ہوئے
 مری قبر پر آ کے کہتے ہیں وہ
 جیا ہے جو مانع، تو آتی ہے شرم
 ز توڑو تو! دل شکستوں کے دل

۷ مصرع طرح

کھنچے تیغ کے ساتھ، ابرو ترے
 مجھے دیکھ کر، ہاے، شرما گئے
 دکھا کر وہ زلف سیہ، چل دیے
 خدا جانے کب دل میں آئے، گئے
 گلی سے تری ہم نے دیکھا ہے، حورا
 تمنا سے دل کو تے خوف سے
 ستم پر ستم اور ڈھاتے ہوئے
 چھپے، ہاتھ سے منہ چھپاتے ہوئے
 بلا میسرے پیچھے لگاتے ہوئے
 انھیں آتے دیکھا، نہ جاتے ہوئے
 ہوا باغِ جنت کی آتے ہوئے
 زبان تک بھی ڈرتے ہیں لاتے ہوئے
 گھلے جاتے ہیں آہ! ہم عشق میں
 اثر آہ کا آزماتے ہوئے

(خدا نگ نظر، نومبر، ۱۹۰۰ء)

(۱۱) ۷

ظاہری صاحب سلامت اور ہے
 تھا لڑکپن قہر، اب آیا شباب
 حاجت طوق و سلاسل کچھ نہیں
 بیوفا ہیں سارے عالم کے حسین
 ظلم میں ان کے غضب کا ہے مزہ
 سامنے وہ، اور میں نظروں سے دور
 ہم سے کیا محشر میں ہوگی باز پرس
 گرمی داغ دل سوزاں ہے اور
 قتل کر کے لاش بھی کر پامال
 اور راہ و رسم و الفت اور ہے
 یہ قیامت پر قیامت اور ہے
 عا شق گیسو کی وحشت اور ہے
 ان کی صورت اور سیرت اور ہے
 اس لیے دل کو محبت اور ہے
 پار آئینے کی قسمت اور ہے
 شیخ! اس کی شانِ رحمت اور ہے
 حسدت مہر قیامت اور ہے
 "ایک بکلی، ایک حسرت اور ہے"

۱۔ مصرع طرح تھا، جھکتے ہو کیوں دل میں آتے ہوئے
 ۲۔ مصرع طرح

ورد کی دل میں کھٹک پہلے سے تھی آپ کا سنا قیامت اور ہے
خساک تک تو کر چکے برباد تم اب بھی کیا دل میں کدورت اور ہے؟
ہم شبِ فرقت میں مر مر کر جیے کیا کوئی باقی قیامت اور ہے
کیا کہوں میں حالِ آہِ دھڑومی
ان دنوں رنگِ طبیعت اور ہے

(خدیجہ نظر، دسمبر ۱۹۶۰ء)

(۱۲)

کبھی وہ جان کا دشمن، وہ قاتل یاد آتا ہے
کبھی پہلو سے خال دیکھ کر دل یاد آتا ہے
چلے جاتے ہیں اٹھتے بیٹھے ہم دشتِ غربت میں
وطن اپنا ہمیں منزل، بمنزل یاد آتا ہے
پھنسے اک اُن سے الفت کر کے ہم دُہری نصیبت میں
ادھر وہ یاد آتے ہیں، ادھر دل یاد آتا ہے
رہا پہلو میں جب تک ہم اسے سمجھا کیے دشمن
گنوا بیٹھے ہیں تو کم بخت اب دل یاد آتا ہے
گزرتا ہے نظر سے جب کوئی پھولا پھلا گلشن
تو پہروں ہم کو اپنا رنگِ محفل یاد آتا ہے
مزے کی نیند گو آتی ہے آغازِ جوانی میں
مگر انجام میں یہ وقتِ نامل یاد آتا ہے
کبھی جس دل کو ظالم! دمہدم تو یاد آتا تھا
اب اپنا ہم کو وہ آیا ہوا دل یاد آتا ہے
ہماری بیگناہی پونہتی رہتی ہے قاتل سے
کبھی تم کو کون ناکام بسمل یاد آتا ہے

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

بُرا ہوتا ہے صدمہ ہم نشین کے ہجر کا اے آہ!
کلیجہ کوئی مل دیتا ہے جب دل یاد آتا ہے

(از بخدا، مخزن، جنوری، ۱۹۰۶ء)

(۱۳)

قصا کیوں ہجر میں آتی نہیں، گر آنے والی ہے
کہ اب ٹوٹے ہوئے دل کی نہایت خستہ حالی ہے
اثر کیونکر رہے کچھ دیر ناصح کی نصیحت کا
مزاج اپنا ہے زندان، طبیعت لا ابالی ہے
مری پھولوں کی محفل میں وہ اپنے دل میں نینتے ہیں
مگر ظاہر میں صورت رونے والوں کی بنالی ہے
تلق یہ ہے کہ نازک پاؤں دکھ جائیں قاتل کے
وگر نہ فخر کی حساب مجھ کو دل کی پامیالی ہے
بہار اس گلبدن کو ہر روش پر نذر دیتی ہے
دم سیر چمن ہر شاخ گل پھولوں کی ڈالی ہے
اگر ساقی اجازت دے، تو اشک سرخ سے بھر دیں
بھرے بیٹھے ہیں ہم محفل میں جبکہ جام خالی ہے
غضب کا ہے، قیامت کا ہے، یہ چلتا ہوا جادو
کیا دیوانہ اس کو تم نے جس پر آنکھ ڈالی ہے
اگر چاہا خدا نے، گھر کر نیچے غیر کے دل میں
نئی اک راہ ہم نے ان سے ملنے کی نکالی ہے
یہ کس نے اپنے پیارے نائنوں چٹکیاں لی ہیں
کہ دل میں جو نشان زخم باقی ہے، ہلالی ہے

سنی ہے مدتوں میں یوں شہیدِ ناز کی تربت
 کہ ہر قاتل نے چٹکی چٹکی اس پر خاک ڈالی ہے
 جلا رکھو چراغ، اے آہ! دن سے اپنے گھر میں تم
 اندھیرا ہو چلا، شامِ جدائی آنے والی ہے

(مخزن، فروری، ۱۹۰۶ء)

(۱۴)

کیا کہوں خنجر اٹھایا اس نے کس انداز سے
 مرنے والا قاتل سے پہلے ہی بسمل ہو گیا

(۱۵)

چارہ گر چکے سے کیا پڑھ کے دوا دیتے ہیں
 کوستے ہیں مجھے ظالم کہ عسا دیتے ہیں
 ہم فیروں کو بھی کچھ حسن کی خیرات ملے
 جن کو دیتا ہے خدا راہ خدا دیتے ہیں
 کیوں کروں میں خلشِ خارِ تمتا کا علاج
 یہ کھٹکتے ہوئے کانٹے تو مزادیتے ہیں

۱۔ مخزن، جاوید، ۱۱۳

تضمین

ایک نظم بعنوان "انجن" مخزن اگست ۱۹۰۲ء میں ادارے کے حسب ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے:

کلکتے کی ایک علمی انجن میں شرکت کے لیے لوگوں کو ترغیب دینے کے واسطے مندرجہ ذیل چند بند مولوی غلام یسین صاحب آہ دہلوی مقیم کلکتہ نے ایک جلسہ میں پڑھے ہیں۔ اور اب بہ نظر اشاعت دفتر مخزن میں ارسال فرمائے ہیں اور ساتھ ہی چند تمہیدی سطریں لکھتے ہیں:

ملک الشعراء ناصر بخاری کی غزل پر یہ اردو کے بند کہے گئے ہیں۔ یہ وہی ناصر بخاری ہے جس نے مکہ شریف جاتے ہوئے بغداد میں چند روز قیام کیا اور وہاں کے شاہی استاد خواجہ سلمان کو اپنے گروہ تلامیذہ میں داخل کیا۔ یہاں اختصاراً بیان کیا جاتا ہے اُس کی حالتِ افلاس اس قابل نہ تھی کہ خواجہ سلمان جیسے کے گھر پر ملاقات کی غرض سے جاتا۔ اتفاقاً ایک دن دریاے دجلہ کی سیر کو خواجہ صاحب مع معززانِ شہر و شاگردان مشتاق تشریف لائے۔ آپس میں بڑی دیر سے یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اب کے سال (کچھ دنوں پہلے) دجلہ بڑے زور و شور پر تھا

اور خوب چڑھ آیا تھا۔ ناصر نے ان کے یہاں آنے کی خبر سن پائی۔ اپنی اسی
خستہ سالی کا تحفہ لے ہوئے جا پہنچا اور موقع پا کر سلام کیا۔ خواجہ صاحب
نے کہا "چہ کسی" ناصر نے جواب دیا کہ "مردِ غریب شاعر"۔ اسی اثناء میں
خواجہ سلمان کی زبان سے یہ مصرع نکل گیا۔

دجلہ را امسال رفتارِ عجب مستانه بود

پھر کر جوشِ گردوں کی سمت نظر اٹھائی، سب کو سرنگوں پایا۔ کسی نے
ثانی مصرع نہیں کہا۔ سب کے سب "تفکر کے دریا میں غوط کھانے لگے۔

مایوسی کے عالم میں (بطور امتحان) سلمان نے ناصر سے کہا

ار تو شاعر ہستی، مصرعہ شنائیش بگو

ناصر نے کچھ آگے بڑھ کر کہا "بچشم"

دجلہ را امسال رفتارِ عجب مستانه بود

پاسے در زنجیر و کف برب، مگر دیوانہ بود

خواجہ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ دوڑ کے معافہ کیا۔ نام پوچھا اور بعد

تعریف دستائیش سیدھے گھر لے آئے اور بڑی عزت کی اس کا شہرہ تو

سنا ہی ہوا تھا اب عین الیقین کا رتبہ حاصل کرتے ہی اپنے کلام پر اصلاح

لی اور ناصر بخاری کی شاگردی کا فخر پایا۔ ناصر نے اسی وقت یہ پانچ شعر کی

غزل کہی تھی جو بغداد میں عام زبان زد ہو گئی تھی اور جسے بغداد والے ہر کہ

دمہ کی زبان پر پاتے تھے۔

نظم "انجن" ملاحظہ کیجیے:

اجمال کی تفصیل ہے اور بات ہے ایسی

اوروں سے تو مطلب نہیں، میں کہتا ہوں اپنی

زور کشش سلسلہ الفتِ جاناں

کیونچے لیے جاتا ہے مجھے سوے گلستاں

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

پھولوں سے سرور کار، نہ کانٹوں سے عداوت
 گلچیں سے نہ آن بن ہے، نہ بلبل سے محبت
 "مارا ہو کس صحبت جاں پروریار است"
 "ورنہ غرض از بادہ پرستی نہ خسار است"

دو چہار اکٹھے ہوں اگر بات کے پورے
 پورے ہوں، کبھی کام نہ رہ جائیں ادھورے
 ہمت کی طرح چاہ کے انداز فسروں ہوں
 رکھتے ہی قدم بزم میں سرگرم جنوں ہوں
 جو عشق کے بندے ہیں، وہ غم کھائیں تو کھائیں
 جو مرد ہیں میعداں میں، وہی آئیں تو آئیں
 "آتش نفاں قیمت مینخانہ شناسند"
 "افسردہ دلاں را بخرابات چہ کار است"

مشتاق ہیں، مشتاق ہیں، صورت تو دکھاؤ
 مطلب کی کہو، آؤ، ذرا ہاتھ ملاؤ
 مل بیٹھ کے دس پانچ کرو کام کی باتیں
 کٹ جائیں کبھی مسئلہ عشق میں راتیں
 یاں آؤ، تو معلوم ہو ایمان کی حالت
 مل جاؤ تو کثرت ہی بتاؤں تمہیں وحدت
 "در مدرسه کس رانہ رسد دعوائے توحید"
 "منزل گہ مردان موحّد ہر دار است"

تم پہلے تو ملتے نہیں، یہ دیکھ کے نقشہ
 ملتے ہو تو سنتے نہیں، پھر دل کی کہیں کیا
 اسلام ہے، اسلام کی بوباس نہیں ہے
 بوباس ہے، بوباس کا کچھ پاس نہیں ہے
 جب شکل ہی بھونڈی ہے تو انداز سے حاصل
 تم روح تو رکھتے نہیں اس ساز سے حاصل!
 "سبح چه کار آید و سجدہ چه باشد!"
 "بر مرکب بے طاقت روح، این ہمہ بار است"

اپنوں کا برا حال تو دیکھا نہیں جاتا
 ہم جیسوں کو ہنسا نہیں آتا، نہیں آتا
 کیوں دور پڑے پھرتے ہیں، مل جائیں خدا!
 شکل اپنی ہمیں بزم میں دکھلائیں خدا!
 اور یہ نہیں، تو آدے سے کہ دیں کہ نہ آنا
 پھر آدے کی حالت کو نہ پوچھیں، نہ ٹھکانا
 "ناصر اگر از ہجر بنالد عجیب نیست"
 "مہجور زیا راست و پریشاں ز دیار است"

یعنی انجمن کی جاتی ہے اور یہ انیس الاسلام کا جلسہ انھیں دعوت دیتا ہے جو شریک نہیں ہوتے ہیں۔

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

رام کہانی

پہلے ہم بچے تھے اک نادان تھے
 بے نوا تھے، بے سرو سامان تھے
 بچپن کے ہاتھ سے مجبور تھے
 رات دن کے کھیل میں سرور تھے
 پھر جوانی آئی تو آئی بہار
 خوب دیکھی گمراہی لیل و نہار
 بے سرو سامانیاں جاتی رہیں
 اگلی آنا کانسیاں جاتی رہیں
 مستیاں سو جھیں، ہوس کی مان لی
 ٹھان لی جو کچھ کہ دل میں ٹھان لی
 جس نے ٹوکا بے تکلف کہ دیا
 آخرت تو آئے، دیکھا جائے گا
 "ساقیا، بر خیز و دروہ جام را"
 خاک بر سر کن غم ایام را
 علم سیکھا اور ہی کچھ ہو گئے
 رات کے جاگے ہوئے تھے سو گئے
 پھر نہ جاگے عمر بھر خواری ہوئی
 قبر میں لیٹے تو بیداری ہوئی!

کچھ ابوالکلام آنا د کے بارے میں

ایسی بیداری سے سونا خوب تھا
 اور اس سونے پہ رونا خوب تھا
 ”مرد ماں را سر بسر در خواب داں
 گشت بیدار انکہ اور رفت از جاں“
 ایک ظاہر تھا تمیہا اور بھی
 ایسے دیوں نے اڑایا اور بھی
 واہ کیا کہنے میں چہرہ دیکھیے
 رحمت حق کا تماشا دیکھیے
 اب تو ہر مسجد کے منبر سج گئے
 اور کیا حضرت کے ڈنکے بج گئے
 آپ کو کوشش سے یہ زتبہ ملا
 یسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى
 مل گئی تقدیر بھی تدبیر سے
 آدمی سونا بنا اکیر سے
 ماہر ہر علم حضرت ہی تو ہیں
 ماحی تغیر و بدعت ہی تو ہیں
 آپ کو سچوں میں سچا جانے
 جانے اچھوں کو اچھا جانے

ایسی باتوں سے بڑھا کبر و غرور
 بڑھتے بڑھتے پڑ گئے رستے سے دور
 پہلے رحمت تھی تو زحمت ہو گئے
 نغصہ سے گمراہ امت ہو گئے

کچھ ابوالکلام آنا د کے بارے میں
 ہو گئے سرست صہبا سے خودی
 بن خودی میں کچھ نہ سوجھی دور کی
 جب ہوا سے نفس میں رہنے لگے
 آدمی کو آدمی کہنے لگے
 خود پرستی کی طرح غفلت بڑھی
 خود کو بھولے غیر سے اُلفت بڑھی
 کاشک ہم دلدار پر رکھتے نظر
 اعتمادے نیت بر علم و ہنر

جب ہوئی اس ابتدا کی انتہا
 ہو گئی اس انتہا کی ابتدا
 انگلیاں اٹھیں، تماشا ہو گئے
 چار سو عالم میں رسوا ہو گئے
 ایک نے بڑھ کر کہا: حضرت یہ کیا؟
 آپ ہی ہیں ہاڑی امت، یہ کیا؟
 خود کو بھولے اور خودی میں آگے
 منہ بھی یوں آئے کہ منہ کی کھا گئے
 آپ اپنی ذات سے ماہر نہیں
 بات جو مخفی ہے، وہ ظاہر نہیں
 ”مولوی گشتی و آگاہ نیستی
 خود کجا و از کجا و کیستی“
 معرفت کیا چیز ہے، فرمائیے!
 آپ سمجھے ہیں، تو کچھ سمجھائیے!

کچھ ابوالکلام آنا د کے بارے میں
 "ایں روا آل ناروا' دانی تونیک
 تو روایا ناروالی' ہیں تونیک
 تو ہمیدانی بجوز دلا بجوز!
 خود نمیدانی کہ حوری یا عجوز!"

مرگ کے ظاہر نشاں ہونے لگے
 تیر سے، حضرت کہاں ہونے لگے
 پر نہ سمجھے، آپ کو یہ کیا ہوا
 آپ کا کہنا، مرا کہنا ہوا
 علم کے دنیا میں جھنڈے گر گئے
 پھر بھی تو لینے کے دینے پڑ گئے
 "صد ہزاراں علم دارد از علوم
 جان خود را می ندانند این ظلوم"

داغ دو کھائے ہیں رونا ایک ہے
 آنکھ کا ہونا نہ ہونا ایک ہے
 "لے بسا عالم زدانش بے نصیب
 حافظ علم است آن کس نے عجیب"
 بانے سب منطق کا جھگڑا پیچ ہے
 پیچ ہے مغزی و کبریٰ پیچ ہے
 "عمر در محمول و در موع رفت
 بے بصیرت عمر در موع رفت
 زندگی مغزی ہے، کبریٰ ہے مات

کچھ ابوالکلام آنا اور کے بارے میں

حدِ اوسط ہے غدالوں سے نجات
 رہ گیا باقی نتیجہ "وصل دوست"
 "ہر دو عالم یک فرخِ روئے اوست"

معرفت کے لفظ نے سمجھا دیا
 اک خودی گم ہو، تو مل جائے خدا
 گھر سے نکلو، شکل دیکھو راہ کی
 معرفت ہے نفس سے، اللہ کی
 خود کو پہچانو، تو اس کو جان لو
 مان لو، اے آہ! کہنا مان لو

(مخزن، دسمبر ۱۹۰۲ء، بحوالہ ہماری زبان، یکم اگست ۱۹۶۹ء)

کچھ اور دیکھ لیتے

بیچین کر رہی ہے یہ مختصر کہانی
 جب چل دیا لڑکپن اور آگئی جوانی
 کچھ اور ہو گیا دل کچھ اور ہو گئے ہم
 کھو کھو کے مل گئے ہم مل مل کے کھو گئے ہم
 کہتے یہ محتب سے، معذور وار مارا
 اک بات تھی: "سکرنا یا ایہا السکارا"
 سب سے جدا رہے ہم نقشہ جدا ہی دیکھا
 آنکھیں جدھر اٹھائیں، عالم نیا ہی دیکھا
 علم و ہنر کے ہاتھوں ہم باکمال ٹھہرے
 ہم ذی جلال ٹھہرے ہم ذی جمال ٹھہرے
 جانا تو کیا نہ جانا، سیکھا تو کیا نہ سیکھا
 سب کام ہم نے سیکھے، پر دیکھنا نہ سیکھا

کچھ ابوالکلام آنا، ار کے بارے میں

سر بہت لگایا، چشمہ بہت چڑھایا
جو دیکھنے کا حق ہے، وہ دیکھنے میں آیا
نا کامیاب رہنا، تقدیر میں لکھا تھا
کیا خاک دیکھتے ہم، جب دیکھنا نہ آیا

ہم کو ہماری فطرت جلوے دکھا رہی ہے
اک چیز جا رہی ہے، اک چیز آرہی ہے
بڑھنے لگی ضعیفی، ڈھلنے لگی جوانی
آنے لگا بڑھاپا، ٹلنے لگی جوانی
ہے اصولِ نیچر، آخر کو رنگ لائے
اور مضمحل قوسی نے رہ رہ کے گل کھلائے
اعضا میں کیا رکھا تھا، ڈھانچے میں کیا دھرا تھا
اک موت کا فرشتہ سر پر کھڑا ہوا تھا
آئے خزاں کے جھونکے، بچنے کے گلستاں میں
مرنے کی شکل دیکھی، آئینہ جہاں میں
پھر خاک میں ملے ہم، یاد آ گیا کندھلنا
قسمت پکار اٹھی، "اب دیکھنا، سنبھلنا"

پڑی لگی چٹنے، چٹھنے لگے پسینے
واقع میں عمر بھر کے بدلے لیے زمیں نے

۵ میرے سامنے خدنگِ نظر کی وہ جلد ہے جو کبھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے کتابخانے میں رہی ہے۔ جس

شمارے میں یہ نظم شائع ہوئی تھی، اس میں سرخ روشنائی سے یہ شعریوں بنا دیا گیا ہے۔

سرے بہت لگائے، چشمے بہت چڑھائے
جو دیکھنے کا حق ہے، وہ دیکھنے میں آئے

یہ اصلاح مولانا آزاد کے قلم سے بھی ہو سکتی ہے اور خود آہ کے بھی، کیونکہ یہ جلد ان دونوں کے پاس رہی ہے۔ (م۔و۔)

آنکھیں جو بند کر لیں، گویا کہ کچھ نہ دیکھا
 پایا کہ کچھ نہ پایا، دیکھا کہ کچھ نہ دیکھا
 اُن تِن بدن کی رگ رگ رہ کے جل ہی ہے
 اور دیکھنے کی حسرت دل میں چل ہی ہے
 سینے میں رہ گیا دل، دل میں رہی تمنا
 کچھ اور دیکھ لیتے، یہ رہ گئی تمنا
 دنیا میں ہم نے دیکھا سب کچھ، مگر نہ دیکھا
 کیا یہ بھی دیکھنا ہے، جو دیکھ کر نہ دیکھا

(خدا ب نظر، اگست، ۱۹۰۲ء)

رباعیات

یہ آپ سے کیا کہوں کہ اب کیسا ہوں
اللہ کا شکر ہے کہ میں زندہ ہوں
ہوں سلسل بول و در دوسرے رنجور
رنجور کے اصرار سے یاں آیا ہوں

بیداری شب سے تپ بڑھا کرتی ہے
اور فکر یہ تکلیف سوا کرتی ہے
سب کچھ مانا، مگر کہاں تک انکار
ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے

[اُردو ادب (آزاد نمبر): ۲۹۲]

فردیات

ہم نہ کہتے کہ یوں نہ چلے دو تم اگر بات کے دھنی رہتے
زشت رو کو حیس سے کیا نسبت آسماں کو زمیں سے کیا نسبت

ہنس ہنس کے داغہاے جگر دیکھتے بھی ہیں
اور یہ بھی کہ رہے ہیں کہ شوق چمن نہیں

[اُردو ادب (آزاد نمبر): ۴۴]

۵ مولوی محمد یوسف جعفری رنجور مراد ہیں۔

قطعات

عدو کے ساتھ وہ تصویر اپنی کھینچوائیں
ہماری پاس بھی بھیجیں اُسے شرارت سے
نئے طریق سے اظہارِ رسم و راہ کریں
کہ حال رشک سے رورو کے ہم تباہ کریں
ہماری سر کی قسم ہے اُنھیں جو آہ کریں
غضب ہے اس پر زبانی پیام بھی آئے

(ماخوذ از ابوالکلام آزاد، مرتبہ بٹ)

ہر سمت سے آرہی ہے آواز
اللہ! ہماری شرم رکھ لے
اللہ بھلا! بشر بُرے ہیں
تیرے ہی تو ہیں، اگر بُرے ہیں

اسراف کی دھوم ہر کہیں ہے
اور اس کا نہیں خیال دل میں
پابندیِ رسم و نشیں ہے
اب گھر میں ہمارے کچھ نہیں ہے

پیری میں رورہا ہے جوانی کو پیر مرد
یعنی وہ اگلے رنگ کے اب کھیل ہی نہیں
اک خواب تھا زمانہ ماضی کی چاہتیں
اگلا سا اب ملاپ نہیں، میل ہی نہیں
پہلو میں دل ہے، دل میں منگوں کا کال ہے
کیونکر جلے چراغ کہ اب تیل ہی نہیں

پی کے کرنا مذمتیں مے کی
جس میں حق الیقین کی بو ہو
تو نے داعظ! مری سنی ہی نہیں
ایسی تو نے کبھی کہی ہی نہیں
ہماری کجبت! تو نے پی ہی نہیں

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

رات کھتی ہے بہر صورت فقیر و شاہ کی
اس نے ہنستے کاٹ دی اور اس نے روتے کاٹ دی
گو کہ دن کا جاگنا بھی غفلتوں کے ساتھ ہے
پر ہمیں دیکھو کہ ہم نے رات سوتے کاٹ دی

پتہ تم کو کیا ہوا، اے اسیرانِ ہمصنیر!
اتھتے نہیں ہلائے سے بھی، سو گئے ہو کیا؟
ہم تو وہی ہیں اگلے تمہارے نیاز مند
چپ چاپ کیوں ہو، ہم سے خفا ہو گئے ہو کیا؟

آرام کی چیزوں سے میسر نہیں آرام
دنیا میں ہر اک طرح سے مشکل ہے بشر کو
تھک تھک کے رہ جاتے ہیں کیوں راہ طلب میں
کیا سر پہ کوئی لے کے چلے پائے سفر کو

شاعری اصلاً غلط گوئی نہیں
جھوٹ کہنا شاعروں کا کام ہے
سب انھیں گنڈوں کے گندے ہیں خیال
شاعروں سے شاعری بدنام ہے

(مخزن، اگست، ۱۹۰۴ء)

قطعَاتِ تَارِيخِ

انتقالِ پُرطال ملک الشعرا جناب منشی امیر احمد صاحب امیریناں لکھنوی
نور اللہ مرقدہ استادِ نوابِ رامپور خلد آشاں

”فاتِ ہیہاتِ امیرِ الالفتاب“

۱۳۱۸ھ

بزمِ رفتِ کانِ علمِ وادب قرصِ خورشیدِ دریا ہی شد
آہِ تمگیں نوشتِ سالِ وفات دے مفتی امیر راہی شد
۱۳۱۸ھ

”قدسی صفاتِ سوے ملکِ بقاشد“

۱۳۱۸ھ

آہ، سرتاجِ بزمِ شعر و سخن! آہ، ذمیِ علمِ مفتی و منشی
مل گئیں خاکِ میں امیدیں سب ہاے بیوقت تو نے رحلت کی
بلبلِ طبعِ بول اٹھی پے سال ”آہ، باغِ سخن میں آگ لگی“
۱۹۰۰ء

صاحبِ وقار بخلد رسید

۱۳۱۸ھ

طوطیِ باغِ سخن استادِ دہر حضرتِ مفتی امیر لکھنوی
فی الحقیقتِ علم کے بدرِ منیر واقعہ مہرِ لیاقتِ واقعہ
رنگِ آتش، عزت افزاے امیر فخرِ ناسخ، فخرِ میسر و مضمحل

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

ان کو ہر اک نظم میں تھی دستگاہ
کیا رباعی، کیا غزل، کیا مثنوی
تھے قصیدے میں ہوس سے بھی زیاد
غیرتِ عرفی کہوں یا انوری
کیا بچباں ان کا چراغِ زندگی
شمعِ بزمِ شاعری ہی بجھ گئی
آہ! لکھو مصرعِ سالِ وفات
"ہو گیا تاراج ملکِ شاعری"

۱۳۱۸ھ

ایک جاتا ہے، ایک آتا ہے
کہیں ماتم، کہیں ہے بزمِ نشاط
فاسموا کلّ من علیہا فان
آہ، منشی امیر احمد، آہ
سوز ہے دل میں لب پہ نالہ و آہ
پے تاریخ سنگِ تربت پر
ہاے، دنیا مقامِ عبرت ہے
کہیں غم ہے، کہیں مسرت ہے
ایک اللہ کو تداوت ہے
تیرا مرنا بھی اک قیامت ہے
ایسے ماتم کی کس میں طاقت ہے
لکھ دو: از حد خدا کی رحمت ہے

۱۳۱۸ھ

(خداگ نظر، نومبر، ۱۹۰۰ء)

باہتمام نظر یافتیں چہ حسن قبول
بلند شد ز فلک پایہ خداگ نظر
دعا یہ پے آغازِ سالِ گفتم، آہ!
کہ باد بر سر ما، سایہ خداگ نظر

۱۹۰۰ء

قطعہ تاریخ

سہ ماہی نو خدنگ نظر

مہ چسار وہ در برم تاختہ
 چہ محبوب، محبوب، محبوب ہم
 بگو، چوں نباشد دلم شاد شاد
 بہر طور زحمت کشیدن چہ سود
 ز نام دل آویز پرسی اگر
 چہ گویم ز تعریف آویلی
 خدنگ نظر، گلشن بیخزاں
 خدنگ نظر! اے خدنگ نظر!
 بدل نیک دانم کہ شد سال نو
 چہ از بہر تفصیل اجمال شد
 دگر مصرع سال ازاں خوبتر
 مکانم مگر آسماں ساختہ
 چہ مطلوب، مطلوب، مطلوب ہم
 حق او را چہا حسن جاوید داد
 کہ گلہا بسیں، خارچیدن چہ سود
 بے گویت، کو خدنگ نظر
 چہ خوانم ز توصیف آویلی
 کہ اشعار گلہا، نظر باغباں
 دعا گوے تو آہ شام و سحر
 زمین نمے شادمانی شنو
 خدنگ نظر دیدنی، سال شد
 کہ محبوب زیبا خدنگ نظر

(خدنگ نظر، فروری ۱۹۰۲ء)

۱۔ آصف جاہ ششم میر محبوب علی خان نظام حیدرآباد کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ مدیر خدنگ نظر، منشی نوبت رائے نظر

قطعہ تاریخ

جشنِ تاجپوشی اعلیٰ حضرت شاہ انگلستان

شہنشاہ ہندوستان خلد اللہ ملکہ

در صنعتِ حروفِ منقوٹ



شہساز شو مجو بادہ نوشی	بغیر شد جشنِ تاجپوشی
بعیش کوشی بعیش کاری	مبارک این تخت و تاج بادا
زرنج رستی کہ پت و چاتی	بذوق دستی، بجام و ساقی
بلطف ہستی بکامگاری	مبارک این تخت و تاج بادا
بحرفِ منقوٹ سالِ گفتم	بہیں چہ درہائے نغزِ سفتم
عجیب رسمے و ملکہ اری	مبارک این تخت و تاج بادا

۱۹۰۲ھ

خسرو! تو با احترام بمان	برہمہ احترام تو ماند
نام تو ورد ہمہ صنیر و کبیر	تاجہانت نام تو ماند

آہ گفت این دعایہ مصرع

"عمر و دولت بکام تو ماند"

۱۳۲۰ھ

در صنعتِ تخریب

اتفاقاتِ کل جو آنکھیں بند کیں
تخت پر دیکھا اسی جہاں کو
آہ نے اٹھ کر دعائیت کہا
”تیا چوشی راس آئے شاہ کو“

(۱۳۲۶-۶ = ۱۳۲۰ھ)

قطعاتِ تاریخِ سالِ پنجمِ خدنگِ نظر، لکھنؤ

خوشا نظم و نثر فصیحانِ ہند زہے اہتمامِ جنابِ نظر
پے سالِ پنجمِ دمِ گفت: آہ کہ بستیاں نمودہ عجبِ خوبتر
(۱۹۰۱ء)

ولہ

از تازہ ترین گہاے مضامین غنچہٴ دلِ بشگفت ز شادی
آہ! بجفتم مصرعِ ساشس ”باغِ سخنِ گلہ ستہ خوبی“
(۱۹۰۱ء)

(خدنگِ نظر، فروری، ۱۹۰۱ء)

مکتبہ جامعہ ملیٹڈ کی نئی اور اہم مطبوعات

۶۶/۰	ہالکدرام	(تحقیق)	تحقیقی مضامین
۳۶/۰	داؤد درہبر	(سوانح نامہ برہنہ موسیقی)	باتیں بچہ سرٹلی سی
۲۱/۰	مجیب رحمتی	(تحقیق)	خسرو نامہ
۵۱/۰	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	(تعلیم)	تعلیم و تربیت اور والدین
۴۵/۰	جلگن ناتھ آزاد	(سفر نامہ)	کولمبس کے دیس میں
۴۵/۰	عمیق حنفی	(ڈرامے)	پتھر بونے تھیں۔۔۔
۲۱/۰	رفتہ سروش	(ناول)	ریت کی دیواریں
۳۳/۰	کشمیری لال ڈاکر	(ناول)	منجھ بادل
۳۰/۰	کشور ناہید	(شعری مجموعہ)	داڑھوں میں پھیلی لکیر
۳۰/۰	زاہد ڈار	(شعری مجموعہ)	آنکھ میں سمند
۵۲/۰	انتظار حسین	(ناول)	تذکرہ
۲۱/۰	مہدی جعفر	(سائنس)	ذمے کی کہانی
۱۲/۰	مولانا اسلم حیراج پوری	(سوانح)	حیات جانی
۸/۰	پروفیسر ریاض الرحمن شیروانی	(خطبہ)	مسلمانان ہند سے وقت کے مطالبات
۵۱/۰	رتبہ: عبدالحق خاں	(مضامین)	نقشہ ڈاکر
۵۰/۰	شمس الرحمن حسنی	(تاریخ)	ہندوستانی مسلمانوں کی توہی تعلیمی تحریک {جامعہ ملیٹڈ اسلامیہ}
۸۵/۰	عادلین آزاد فاروقی	(علمی)	دنیا کے بڑے مذہب
۴۵/۰	ڈاکٹر سلامت اللہ	(مضامین)	تعلیمی نفسی کے بچے اور دیگر مضامین
۴۵/۰	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	(تعلیم)	تعلیم اور رہنمائی
۱۵/۰	سین الین	(تعلیم)	ہم آہ دو کیسے پڑھائیں
۴۰/۰	ترجمہ تمیم حنفی	(آپ بیتی)	یادوں کا اجالا
۵۰/۰	رتبہ: عادلین آزاد فاروقی	(مضامین)	ہندستان میں اسلامی علوم و ادبیات
۲۵/۰	پروفیسر گلن ناتھ آزاد	(سفر نامہ)	پشکن کے دیس میں
۲۱/۰	زاد علی	(شعری مجموعہ)	آنکھ اور خواب کے درمیان
۳۰/۰	رام علی	(اساتذہ)	سدا بہار چاندی
۲۵/۰	شردن کمار ورا	(افسانے)	دل دریا
۱۶/۰	شفیقہ رحمت	(اتالیے)	راگ نیر
۲۸/۰	رتبہ: انور سجاد	(شعری مجموعہ)	رات کے مسافر
۳۹/۰	ترجمہ انور عظیم	(ادرا)	زوال کا عروج
۴۰/۰	شمس الرحمن فاروقی	(تنقیدی مضامین)	انجبات و غلی
۵۰/۰	رتبہ: علی حواد بیدی	(مجموعہ مضامین)	ہالک ڈرامہ - ایک مطالعہ
۱۸/۰	یوسف خانم	(ادبی مضامین)	نی الحال
۳۵/۰	حایت علی شاہ	(شعری مجموعہ)	حور مرور روشنی
۴۰/۰	کفر بیباک	(ناول)	فرار
۱۸/۰	ساکو ماجھی	(اساتذہ)	تین جہر تین آوازیں
۲۸/۰	پہنہ نمبر ممتاز حسین	(تنقیدی مضامین)	نقد حوت
۳۰/۰	سین اسمن چندی	(شعری مجموعہ)	گر از شب
۲۵/۰	انقر لوات	(ادرا)	سربہ کی ششلیس تحریک
۴۸/۰	ہالک ڈرامہ	(مضامین)	اسم پر کوشش کا نقشہ سہ سالہ سفر کی یادداشت عفتہ رماہ

ملیٹڈ، برٹنی آرٹ پریس، پرورد گارڈنز، مکتبہ جامعہ ملیٹڈ، بڑی باؤس دریا گنج محلہ، لاہور۔